ہیمنگ وے
کے
افسانے
پبلشرز یونائیٹڈ لمیٹڈ لاہور

مصنف ——— ارنسٹ ہمینگوے

مترجم ——— مُظفّر احمد

پبلشرز یونائیٹڈ لمیٹڈ ——— ۱۷- انار کلی، لاہور

سلسلہ پاک امریکن مطبوعات ۱۲

اشاعت اوّل ـــــ پندرہ ہزار

اکتوبر ۱۹۶۰ء

محمد امین پرنٹر پبلشر نے علمی پرنٹنگ پریس لاہور سے چھپوا کر
پبلشرز یونائیٹڈ لمیٹڈ ۱۷۶ - انارکلی لاہور کے لئے شائع کیا

حرفِ اوّلین

کسی ملک کی قدامت، اس کی تہذیب و ثقافت کے مختلف ادوار اور ان کے مدوجزر اور اس کی روایات و رسوم کی فراوانی اس بات کی ضامن ہوتی ہے کہ وہاں کے اہلِ فکر و دانش اور خصوصاً قصہ گو کے لئے لکھنے کا بہت سا مواد فراہم کر دے۔ عربی اور انگریزی ادب کے لازوال شاہکار اس کی نمایاں مثال ہیں۔

لیکن ایک "نئی دنیا" میں جہاں تہذیب و تمدن کی بنیاد رکھنے والوں کو آباد ہوئے مشکل سے تین سو سال گزرے ہوں گے، جس ملک کا ذہن روایات سے یکسر خالی تھا اور اہلِ فکر و دانش اگر کوئی تھے بھی، تو ان کے لئے کوئی ایسا مواد موجود نہ تھا جس پر وہ اپنے ادب کی بنیادیں استوار کرتے، قصہ گوئی کے فن کا موجودہ عروج تک پہنچنا ایک معجزے سے کسی طرح کم نہیں۔

یہ معجزہ بھی اسی قسم کا ہے جس طرح کے معجزے اس نئی دنیا میں زندگی کے ہر شعبے میں رونما ہو کر پرانی دنیا کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر رہے ہیں۔

ہمارے دیکھتے دیکھتے ان بلند ہمت امریکیوں نے لکڑی کے بے ڈول جھونپڑوں کو ایسی عالیشان عمارتوں میں تبدیل کر دیا جو آسمان سے باتیں کرتی معلوم ہوتی ہیں۔ زمین کا سینہ چیر کر سونے کے انبار لگا دئے۔ قدرت کی فیاضیوں سے اتنا فائدہ

اٹھایا کہ بنجر علاقے سبزہ زاروں میں تبدیل ہو گئے، مشینوں کے ذریعے الہ دین کے جن کی طرح مہینوں کا کام گھنٹوں اور منٹوں میں لیے جانے لگے، آسمان کی بلندیوں اور سمندر کی اتھاہ گہرائیوں تک کا کھوج لگا ڈالا۔ اور بالآخر ایسی قاہر و باجبروت قوم کی شکل میں نمودار ہوئے کہ آج دنیا کی کوئی قوم اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہیں دیکھ سکتی۔

امریکی ادب کے طالب علم جانتے ہیں کہ عروج و ترقی کی یہی رفتار ان کے ادبی کارناموں میں بھی نمایاں طور پر نظر آ رہی ہے۔ جس کی ان گنت مثالوں میں سے ایک مثال ہم ارنسٹ ہیمنگ وے کے زیر نظر مختصر افسانوں میں پیش کر رہے ہیں۔

چونکہ یہ کتاب قارئین کے سامنے اردو زبان میں پیش کی جا رہی ہے اس لئے ہم یہ تو نہیں بتا سکتے کہ ہیمنگ وے ایک صاحب طرز مصنف ہے۔ وہ زبان پر کتنا قادر ہے اور الفاظ سے کس بے تکلفی اور مشاقانہ انداز میں کھیلتا ہے لیکن اس کی اس قصہ گوئی میں بھی ایک خاص طرز موجود ہے۔

وہ اپنے قصے کے ہر فرد کے جسم میں حلول کر کے اس کی رگوں میں دوڑنے والا خون اور اس کے احساسات کو قبول کرنے والی روح بن جاتا ہے اور ذرا ذرا سی تفصیل کو اس انداز میں بیان کرتا ہے جیسے یہ سب کچھ اس کا فکر نہیں — مشاہدہ نہیں — بلکہ خود اس پر بیتی ہوئی واردات ہے۔ لیکن قصے کے ہر کردار کے جسم میں روح بن کر حلول کرنا اور اس کے جذبات کو من و عن بیان کرنا ہیمنگ وے جیسے قادر الکلام شخص ہی کے بس کی بات ہے اور انگریزی زبان کی وسعتیں ہی اسے اپنے اندر سمو سکتی ہیں۔ ہم کج مج زبان صرف اتنا ہی کر سکتے ہیں کہ اسے حیرت سے

دیکھ کر انگشت بدنداں رہ جائیں۔

مثلاً "کلمن جارو کی برف پوش چوٹی" میں موت کے احساس کو مختلف مدارج میں دیکھئے۔ جس میں افریقہ کے جنگلوں میں ایک زہر باد کا مریض بستر مرگ پر پڑا ہے:۔

"۔ ۔ ۔ ۔ اور عین اس وقت اسے احساس ہوا کہ وہ مر رہا ہے۔ موت اس پر جھپٹتی ہوئی آئی۔ اس طرح نہیں جیسے پانی تیزی سے بہتا ہوا آئے یا ہوا کا تھپیڑا پڑے۔ بلکہ ایک بدبودار خلا کی طرح۔ اور عجیب بات یہ تھی کہ اس خلا کے کنارے وہی چرخ خاموشی سے لپکتا ہوا چلا آرہا تھا"

اور پھر کچھ وقفے کے بعد:۔

"وہ بے حس و حرکت لیٹا ہوا تھا۔ اس وقت موت وہاں موجود نہ تھی۔ شاید وہ کسی اور راستے کی طرف مڑ گئی ہو۔ موت جوڑا جوڑا ہو کر سائیکلوں پر بھی گشت کرتی ہے اور پکے راستوں پر ہوتی ہوئی بڑی خاموشی سے آنکلتی ہے۔"

(مریض کا یہ احساس اس لئے ہے کہ اپنی اوباشانہ زندگی میں پولیس کے سائیکل سوار سپاہیوں سے چھپتا پھرتا تھا)

"—— عین اس وقت موت نمودار ہوئی اور اس نے اپنا سر چارپائی کی پائینتی کے ساتھ ٹیک دیا۔ اسے موت کی سانس کی بُو آرہی تھی۔"

"موت کے متعلق کھوپڑی اور درانتی والا نظریہ بالکل غلط ہے" اس نے اپنی بیوی سے کہا۔ "موت دو سائیکل سوار سپاہیوں کی کی طرح بھی ہوسکتی ہے، یا پرندہ (گدھ) بھی بن سکتی ہے، یا ایک

چرخ کی طرح اس کی چوڑی تھوتھنی بھی ہو سکتی ہے۔"
موت اور آگے سرکی۔ اب اس کی کوئی شکل و صورت نہ تھی۔
اس نے خلا میں صرف جگہ گھیر رکھی تھی۔
"اس سے کہو جائے۔"
لیکن وہ جانے کے بجائے اور آگے سرک آئی۔
"تمہارے سانس کی بدبو جہنم کی طرح بیزار کرنے والی ہے
مُردار چوہیا!"
اب وہ اور آگے بڑھی۔ لیکن اب مریض میں بولنے کی سکت نہ رہی
تھی اور جب موت نے دیکھا کہ وہ بول بھی نہیں سکتا تو اور آگے بڑھ
آئی۔ اب وہ اسے بولنے کے بغیر ہی ہٹانا چاہتا تھا۔ لیکن وہ اتنی
آگے بڑھ آئی کہ اس کا سارا بوجھ چھاتی پر آن پڑا۔ جب وہ چھاتی
پر یوں سمٹی بیٹھی تھی اور وہ نہ ہل سکتا تھا، نہ بول سکتا تھا تو اس نے
عورت کو کہتے ہوئے سنا "بوانا سو گیا ہے، چارپائی آہستہ سے اٹھا
لو اور خیمے میں لے چلو۔"
فرانسس میکومبر کی کہانی میں ذرا منظر کشی اور اس کے ساتھ انسان کی
خونخواری اور بے رحمی پر طنز ملاحظہ فرمایئے :-
"لمبی لمبی گھاس میں پینتیس گز کے فاصلے پر وہ دیو قامت شیر
زمین پر چیت پڑا تھا۔ اس کے کان پیچھے کو مڑے ہوئے تھے اور
اس کے جسم میں صرف اتنی حرکت باقی تھی کہ اس کے کالے بالوں والی

دُم میں اوپر سے نیچے تک تشنج کے ہلکے ہلکے جھٹکے لگ رہے تھے۔ اوٹ میں پہنچتے ہی وہ حملے کے لئے تیار ہو بیٹھا تھا۔ اس کا بھرا ہوا پیٹ زخمی ہو چکا تھا اور پھیپھڑوں کے زخم کی وجہ سے کمزور ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے ہر سانس کے ساتھ پتلی سی خون ملی جھاگ اس کے منہ میں آجاتی تھی۔ اس کے پہلو خون سے تر ہو رہے تھے اور گولیوں سے پھٹی ہوئی جلد پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ اس کی موٹی موٹی زرد آنکھیں جو غم و غصّے سے گھٹی جاتی تھیں سامنے کے رُخ ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی تھیں اور پھر ہر سانس کے ساتھ درد سے بے تاب ہو کر بند ہو جاتی تھیں۔ اس کے پنجے نرم سوکھی زمین میں گڑے جا رہے تھے ...... اس نے ولسن کی رائفل سے "کے۔را۔وانگ" کی آواز سُنی اور پھر ایک اور کیراوانگ کی گرج سنائی دی۔ اس نے مڑکر دیکھا تو شیر جھپٹا چلا آ رہا تھا۔ بڑی دہشت ناک شکل و صورت میں۔ اس کا آدھا سر اُڑ گیا تھا۔ وہ ولسن کی طرف رینگتا ہوا لمبی گھاس کے کنارے کنارے بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ سرخ چہرے والے (شکاری) نے اپنی بدوضع چھوٹی رائفل کا بولٹ چڑھایا اور بڑے غور سے شست لی۔ کیراوانگ کی ایک اور قہرناک گرج ہوئی۔ اور شیر کا عظیم رینگتا ہوا زرد جسم اکڑ کر رہ گیا اور اس کا شاندار کٹا پھٹا سر زمین پر جھک گیا ......

ولسن نے پوچھا۔ "تصویر لو گے؟"

"نہیں" ، میکومبر نے جواب دیا۔

اس استاد کی فنکاری کا یہ صرف ایک نمونہ ہے اور جب آپ کتاب ملاحظہ فرمائیں گے تو جا بجا یہی محسوس کریں گے کہ

کرشمہ دامنِ دل میکشد کہ جا ایں جا است

ہیمنگ وے خود فرماتے ہیں کہ " اس کتاب میں ہر قسم کی کہانیاں ہیں۔ امید ہے کہ ان میں سے چند ایسی بھی ہوں گی جو آپ پسند فرمائیں گے۔"

اپنی حقیقت نگاری سے مجبور ہو کر ہیمنگ وے نے بعض جگہ ایسی باتیں بھی لکھ ڈالی ہیں جنہیں ہم "عریانی" سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ شاید صرف ہماری معاشرت اور تمدن کا فرق نہیں بلکہ خود قدرت کے عطیات میں تفریقی سلوک کی وجہ سے بھی ہے۔ جن ملکوں میں سورج کم چمکتا ہے ' وہاں دھوپ روشنی اور عریانی محبوب ہے اور مشرق کے باسیوں کو کالی گھٹائیں۔ گھنے سائے اور پردہ پوشی مرغوب ہے۔ اسی تقاضائے فطرت سے مجبور ہو کر ہم نے کوشش کی ہے کہ اس عریانی کو کم و بیش ڈھانپتے چلے جائیں۔ اور امریکہ کے اس آزاد منش باشندے کو دیس کے مطابق بھیس اختیار کرنے پر مجبور کریں۔

منظفر احمد

۶ر اکتوبر ۱۹۶۰ء

فہرست

کلیمن جبارو کی برف پوش چوٹیاں

کلیمن جبارو ایک برف پوش پہاڑ ہے جس کی بلندی ۱۹۷۱۰ فٹ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ افریقہ کا سب سے بلند پہاڑ ہے اس کی مغربی چوٹی کا نام "نگاجے نگائی" یعنی خانۂ خدا ہے اسی مغربی چوٹی کے نزدیک چیتے کی ایک سوکھی ہوئی اور یخ بستہ لاش پڑی ہے۔ معلوم نہیں یہ چیتا اتنی بلندی پر کس چیز کی تلاش میں آیا تھا۔

"اور عجیب بات ہے کہ اس میں درد بھی نہیں ہوتا" اُس نے کہا اور یہی اس کی پہچان ہے۔

"کیا سچ مچ؟"

"بالکل یہی بات ہے۔ مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ اس میں سے سخت بدبو آتی ہے اور تمہیں اس سے تکلیف ہوتی ہوگی۔"

"نہیں، نہیں، ایسا نہ کہو!"

"ذرا ان کی طرف دیکھو۔ معلوم نہیں یہ ہمیں دیکھ کر بیٹھے ہیں یا بدبو سونگھتے ہوئے۔ یہاں آن پہنچے ہیں؟"

چارپائی جس پر یہ شخص لیٹا ہوا تھا درختوں کے گھنے سائے میں پڑی تھی - اور جب اس نے ان سایوں سے پرے دھوپ سے چمکتے ہوئے وسیع میدان کی طرف نظر ڈالی تو ان میں سے تین تو زمین پر بیٹھے تھے اور کوئی دس یا دہ فضا میں منڈلا رہے تھے اور ان کے سائے زمین پر تیزی سے گزرتے دکھائی دے رہے تھے۔

"یہ تو اس دن سے یہاں موجود ہیں جب ہمارا ٹرک ٹوٹا"

اُس نے پھر کہا "آج پہلی دفعہ ان میں سے چند زمین پر اُترے ہیں میں انہیں فضا میں تیرتے ہوئے بڑے غور سے دیکھتا رہا ہوں کہ شاید ان کا ذکر کسی کہانی میں کرنے کی ضرورت پڑے۔ لیکن موجودہ حالات میں تو یہ بیکار سی بات معلوم ہوتی ہے"

"ایسی باتیں نہ کرو" وہ بولی

"میں صرف بات کر رہا ہوں۔ بولتے سے تکلیف نہیں ہوتی۔ لیکن میں تمہیں ستانا نہیں چاہتا۔"

"تم جانتے ہو کہ مجھے تمہاری باتوں سے تکلیف نہیں ہوتی۔ مجھے تکلیف اس احساس سے ہوتی ہے کہ میں تمہارے لئے کچھ کر نہیں سکتی۔ بہرحال جب تک ہوائی جہاز نہ آئے ہمیں حالات کو خوشگوار بنانے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہئے"

"یا جب تک جہاز نہ آئے"

"خدا کے لئے بتاؤ میں تمہارے لئے کیا کروں کچھ نہ کچھ تو میں کر ہی سکوں گی"

"کیوں نہیں؟ میری ٹانگ کاٹ ڈالو تو یہ زہر باد آگے نہیں بڑھے گا اگرچہ اس میں بھی مجھے شک ہے۔ یا پھر مجھے گولی مار دو۔ اب تو تمہارا نشانہ بھی اچھا ہے۔ میں نے ہی تمہیں بندوق چلانا سکھایا ہے، کیوں۔

نہیں ؟"

"خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کرو۔ میں تمہیں کچھ پڑھ کر سناؤں؟"

"کیا پڑھو گی؟"

"کتابوں کے تھیلے میں سے کوئی ایسی کتاب جو اب تک نہ پڑھی ہو"

"مجھ میں سننے کی تاب نہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"باتیں کرنا میرے لئے سب سے آسان ہے۔ آؤ آپس میں لڑیں۔ اس سے وقت آسانی سے کٹ جائے گا۔"

"میں نہیں لڑتی مجھے لڑنے کی کیا ضرورت ہے"

اب ہمیں لڑنا چاہیئے ہی نہیں خواہ ہمارے اعصاب پر کتنا ہی بوجھ کیوں نہ بڑھ جائے۔"

"ممکن ہے آج وہ لوگ کوئی اور ٹرک لے آئیں یا پھر ہوائی جہاز ہی پہنچ جائے۔"

"میں تو اب حرکت کرنا نہیں چاہتا۔" اس شخص نے کہا "اب یہاں سے چلے جانے کا کوئی مطلب ہی نہیں ہے۔ بس سوائے اس کے کہ تمہیں سہولت ہو جائے۔"

"یہ تو بزدلی ہے۔"

"کیا تم گالیاں دیئے بغیر کسی کو مرنے بھی نہ دو گی؟ میری تحقیر کرنے سے تمہیں کیا حاصل ہوگا؟"

"تم مرو گے نہیں"

"بے وقوف نہ بنو۔ میں اب مر رہا ہوں۔ ان حرامی پلّوں سے پوچھ لو۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اس طرف دیکھا جہاں وہ تین بڑے نفرت انگیز

جانور بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن کے گنجے سر مڑے ہوئے پروں میں گڑے ہوئے تھے۔ چوتھا بھی ہوا میں سے تیرتا ہوا اُترا، کچھ دُور تک تیز قدموں سے بھاگا اور پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا دوسروں میں شامل ہو گیا۔

"یہ تو ہر کیمپ کے پاس منڈلاتے رہتے ہیں۔ عام طور پر ان کی طرف توجہ نہیں کی جاتی۔ اگر تم نے آس نہ توڑ دی تو تم مرو گے نہیں۔"

"تم نے یہ بات کہاں سے پڑھی تھی۔ تم کتنی بے وقوف ہو۔"

"کسی اور طرف اپنا دھیان بٹاؤ۔"

"اور اب تک میں کیا کرتا رہا ہوں۔"

وہ آرام سے لیٹ گیا اور تھوڑی دیر کے لئے خاموشی سے دھوپ میں چمکتے ہوئے میدان سے پرے جنگل کی طرف دیکھتا رہا۔ دُور فاصلے پر کچھ ہرن پیلی پیلی زمین پر سفید دھبّوں کی طرح نظر آرہے تھے۔ زیبروں کا ایک غول بھی سبز جنگل کے سامنے سفید سفید دکھائی دے رہا تھا۔ کیمپ کے لئے یہ بہت ہی اچھی جگہ تھی۔ اوپر بڑے بڑے سایہ دار درخت تھے۔ پشت کی طرف پہاڑی تھی۔ اور پانی بھی یہاں اچھا تھا۔ پاس ہی ایک سوکھتا ہوا چشمہ تھا جہاں صبح کے وقت پرندے اُڑتے ہوئے نظر آتے۔

"میں تمہیں کچھ پڑھ کر سناؤں۔" اُس نے پھر کہا۔ وہ اُس کی چارپائی کے پاس ہی ایک کپڑے کی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ "ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آنے شروع ہو گئے ہیں۔"

"نہیں، میں نہیں سنوں گا۔ شکریہ۔"

"شاید ٹرک آجائے۔"

"مجھے ٹرک کی پروا نہیں ہے۔"

"مجھے تو ہے۔"

"تمہیں تو کبھی ایسی باتوں کی پروا ہوتی ہے جن کی مجھے نہیں ہوتی۔"

"نہیں میری، یہ بات نہیں ہے۔"

"شراب کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟"

"شراب تمہارے لئے مضر ہے۔ بلیک کی کتاب میں لکھا ہے کہ ہر قسم کی الکحل سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ تمہیں شراب نہیں پینی چاہیئے۔"

"مولو!" اُس نے آواز دی

"جی بوانا۔"

"وسکی اور سوڈا لاؤ۔"

"بہت اچھا، بوانا۔"

"تمہارے لئے یہ مناسب نہیں ہے۔" اُس نے کہا "شراب چھوڑ دینے سے میرا مطلب یہی ہے۔ کتاب میں لکھا ہے کہ یہ تمہارے لئے مضر ہے۔ اور مجھے معلوم ہے کہ یہ تمہارے لئے واقعی مضر ہے۔"

"نہیں! شراب میرے لئے بے حد مفید ہے" اُس نے جواب دیا۔

اُس نے سوچا، اب باقی کیا رہ گیا ہے۔ اب اُسے کچھ اور کہنے کا موقع نہ ملے گا۔ شراب کے متعلق جھگڑے پر یوں معاملہ ختم ہو گیا۔ جب سے اس کی دائیں ٹانگ میں زہر باد شروع ہوا ہے، اُسے درد کا احساس نہیں ہوا۔ اور درد کے ساتھ ہی اس کا خوف بھی جاتا رہا۔ اب اسے انتہائی تکان محسوس ہو رہی تھی اور اس بات پر غصہ آ رہا تھا کہ اس کا یہ انجام ہوا۔ اب جو کچھ اس پر وارد ہو رہا تھا اس کے لئے کوئی عجیب

اُسے محسوس نہ ہوتا تھا۔ سالہا سال سے یہ وہم اسے ستاتا
رہا تھا لیکن اب اس کی وقعت جاتی رہی تھی۔ تکان نے اس
بات کو کتنا آسان کر دیا تھا۔

اب وہ اُن باتوں کو کبھی نہ لکھے گا جو اُس نے اس لئے اٹھا رکھی تھیں
کہ اُن کے متعلق مزید معلومات حاصل ہو لیں۔ اگر وہ ان کے لکھنے کی
کوشش کرتا تو ناکام تو نہ رہتا۔ شاید ان کا لکھنا مقدر ہی میں نہ تھا اس
لئے انہیں اب تک ملتوی کرتا رہا۔ خیر اب وہ اس کے متعلق کچھ بھی جان
نہ سکے گا۔

"کاش ہم یہاں نہ آتے۔" عورت نے کہا۔ وہ ہاتھ میں گلاس لئے اُس
کی طرف دیکھ رہی تھی اور اپنے ہونٹ کاٹ رہی تھی "تمہیں یہ بیماری پیرس
میں کبھی نہ ہوتی۔ تم ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ تمہیں پیرس بہت پسند ہے ہم
پیرس ہی میں ٹھہرے رہتے یا کسی اور جگہ چلے جاتے۔ میں ہر جگہ جانے کو تیار
تھی۔ میں نے تو یہی کہا تھا کہ جہاں کہیں تم جانا چاہو میں تمہارا ساتھ دوں گی۔
اگر تم شکار ہی کرنا چاہتے تھے تو ہم ہنگری چلے جاتے اور وہاں بڑے
آرام سے رہتے۔"

"لیکن تمہاری یہ کمبخت دولت۔" وہ بولا

"یہ تم نے انصاف کی بات نہیں کی۔ اس دولت پر تمہارا بھی اتنا ہی حق
تھا، جتنا میرا تھا۔ میں نے تمہارے لئے ہر شے کو تج دیا۔ اور جہاں کہیں
تم نے کہا میں چل پڑی، اور جو کچھ تم نے کہا وہ کرتی رہی۔ لیکن کاش
ہم یہاں نہ آتے"

"تم تو کہتی تھیں کہ تمہیں یہ جگہ بے حد پسند ہے۔"

"ہاں جب تک تم تندرست تھے۔ لیکن اب مجھے اس سے نفرت ہو گئی ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہاری ٹانگ کا زخمی ہونا کیوں ہماری قسمت میں لکھا تھا۔ ہم نے کونسا گناہ کیا تھا جس کی یہ سزا ہمیں ملی ہے؟"

"میں سمجھتا ہوں کہ پہلا گناہ تو یہ تھا، کہ جب مجھے یہ خراش آئی تو میں نے اس کی پروا نہ کی اور اس پر آیوڈین نہ لگائی۔ پھر میں نے اس کی طرف توجہ دینا ہی چھوڑ دی۔ کیونکہ میرے زخم آج تک کبھی خراب نہ ہوئے تھے۔ اور پھر جب اس کی حالت زیادہ خراب ہو گئی اور دوسری جراثیم کُش دوائیں ختم ہو گئیں تو میں نے اس پر کاربالک کا بڑا کمزور محلول لگایا۔ اسی سے خون کے ذرات مردہ ہو گئے اور زہرباد کی ابتدا ہو گئی۔" اس نے عورت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہی کچھ ہوا ہے۔"

"میرا یہ مطلب نہ تھا"

"اگر تم نے اناڑی ڈرائیور کے بجائے کوئی اچھا مستری ملازم رکھا ہوتا تو وہ تیل ختم ہونے کا خیال رکھتا اور ٹرک کا بیرنگ نہ جلنے دیتا۔"

"میرا یہ بھی مطلب نہ تھا۔"

"اگر تم نے اپنے اعزا اور اقربا کو میرے لئے چھوڑ نہ دیا ہوتا ۔۔"

"ہاں مجھے تم سے محبت تھی۔ بے انصافی نہ کرو۔ میں اب بھی تم سے پیار کرتی ہوں۔ میں ہمیشہ تم سے پیار کرتی رہوں گی کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتے؟"

"نہیں" مرد نے جواب دیا "میرا خیال ہے میں نے تم سے کبھی محبت نہیں کی۔"

"ہیری، تم کیا کہہ رہے ہو؟ تمہارا دماغ خراب ہو رہا ہے۔"

"میرا دماغ ہی نہیں تو خراب کیا ہو گا۔"

"شراب نہ پیو، پیارے، خدا کے لئے اسے نہ پیو۔ جو بات بھی ہمارے امکان میں ہے ہمیں ضرور کرنی چاہیئے۔"

"تو تم کرتی رہو۔ میں تو تھک گیا ہوں۔" اُس نے جواب دیا۔

اب وہ چشمِ تصور سے کاراگاچ کا ایک ریلوے سٹیشن دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنا سامان اٹھائے کھڑا تھا سمپلان اورین کی سامنے والی بتی کی تیز روشنی تاریکی کو چیرتی ہوئی آ رہی تھی۔ فوج کی پسپائی کے بعد وہ تھریس سے رخصت ہو رہا تھا۔ یہ بات اُس نے لکھنے کے لئے بچا رکھی تھی۔ اور پھر صبح ناشتہ کرتے ہوئے اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا تھا۔ اور بلغاریہ کی پہاڑیوں پر برف دیکھی تھی نانسن کی سیکرٹری نے بوڑھے سے پوچھا کہ کیا یہ برف ہے۔ اُس نے بھی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا اور کہا کہ نہیں یہ برف نہیں ہے۔ ابھی برف باری کا وقت نہیں آیا۔ پھر سیکرٹری نے دُوسری لڑکیوں کی طرف مُڑ کر یہی الفاظ دہرائے۔ کہ نہیں تم دیکھ رہی ہو، یہ برف نہیں ہے۔ اور انہوں نے بھی یہی کہا تھا، کہ واقعی تنظیروں نے دھوکا دیا ہے۔ لیکن یہ حقیقت میں برف ہی تھی۔ اور جب آبادی کا تبادلہ کیا گیا تو اِن کو اسی برف میں چھوڑ دیا گیا۔ وہ اس پر چلتے رہے یہاں تک کہ سردی سے اکڑ کر مر گئے۔

اور وہ بھی برف ہی تھی جو گورٹال میں اُس سال کرسمس کا سارا ہفتہ پڑتی رہی۔ اُس سال وہ لکڑہاروں کے مکان میں ٹھہرے ہوئے تھے جہاں مٹی کی چوکور انگیٹھی نے آدھا کمرہ گھیر رکھا تھا۔ وہ اُن گدیلوں پر سوتے تھے جن میں سفیدے کے پتے بھرے ہوئے تھے۔ ایک دفعہ فوج سے بھاگا ہوا ایک آدمی وہاں آیا جس کے پاؤں برف کی وجہ سے لہولہان ہو رہے تھے اُس نے بتایا کہ پولیس اس کا پیچھا کر رہی ہے۔ انہوں نے اُسے اُونی جرابیں دیں اور پولیس والوں کو اتنی دیر باتوں

میں لگائے رکھا کہ اس کے پاؤں کے نشان برف پر سے مٹ گئے۔

شروع میں کرسمس کے دن برف اتنی چمک رہی تھی کہ اس کی طرف دیکھ کر آنکھوں کو تکلیف ہوتی تھی۔ اور جب آپ کھڑکی میں سے دیکھتے تو سب لوگ گرجے میں سے نکلتے اپنے گھر کی طرف آتے ہوئے۔ نظر آتے۔ وہ اس جگہ نظر آتے تھے جہاں دریا کے ساتھ ساتھ آنے والی زرد رنگ کی سڑک، صنوبر کے درختوں سے ڈھکی ہوئی پہاڑیوں کے نزدیک برف گاڑیوں کے چلنے سے ہموار ہو رہی تھی۔ برف پر سے پھسلنے والی لمبی لمبی کھڑاؤں ان کے کندھوں پر تھیں اور جہاں وہ برف کے تودے پر سے پھسلتے تھے برف ایسی نظر آتی تھی جیسے دودھ پر بالائی کی تہہ جمی ہوئی ہو۔ اور ایسی ہلکی جیسے ایک باریک سفوف۔ اسے وہ بے آواز چھلانگیں آج بھی یاد تھیں جن میں وہ پرندوں کی طرح ہوا میں تیرتے نظر آتے تھے۔

وہ ہفتہ بھر میڈلینر ہاؤس ہی میں پڑے رہے تھے کیونکہ برف کی وجہ سے راستے بند تھے۔ برفباری میں ہوا کا جھکڑ چلتا رہا۔ اور وہ دھوئیں سے بھرے ہوئے کمرے میں بیٹھے لالٹین کی روشنی میں تاش سے جوا کھیلتے رہے۔ جوں جوں ہر لنٹ ہارتا جاتا داؤں بڑھتا جاتا۔ آخر وہ سب کچھ ہار گیا۔ برف کی کھیلوں کا روپیہ، پھر موسم بھر کا منافع اور اس کے بعد اپنی ساری جمع پونجی۔ اسے اب بھی وہ سارا منظر یاد تھا۔ اس کی لمبی ناک۔ اس کا پتے کھینچنا۔ ان دنوں ہر وقت جوا ہی کھیلا جاتا۔ جب برفباری بند ہوتی تو جوا ہوتا اور جب برفباری زیادہ ہوتی تو جوا ہوتا۔ اس نے زندگی کا کتنا حصہ جوا کھیلنے میں ہی گذار دیا تھا۔

لیکن ان سب باتوں کے متعلق اس نے کبھی ایک لفظ نہ لکھا تھا اور نہ اس سرد اور روشن کرسمس کے دن کے متعلق جب میدان کے چاروں

طرف پہاڑیاں تھیں پار کر کے ہوائی جہاز لے کر محاذِ جنگ سے آگے نکل گیا اور جب آسٹروی فوجی افسر ریل گاڑی سے نکل کر ہر طرف جان بچانے کے لئے دوڑنے لگے تو اس نے اُن پر بموں سے اور مشین گن سے گولیوں کی بارش کر دی۔ بار کر جب واپس آیا تو کھانے کے کمرے میں بیٹھ کر اس بمباری کے حالات سنانے لگا۔ ہر طرف خاموشی چھا گئی تھی۔ جب وہ حالات سنا چکا تو بیچ میں سے کوئی پکار اُٹھا "ملعون، خونی کتا!"

یہ وہی آسٹروی تھے جن کے ساتھ مل کر وہ بعد میں برف پر پھسلنے کے کھیل کھیلتا رہا تھا۔ بالکل وہی تو نہیں، کیونکہ وہ تو سب کے سب مارے گئے ہوں گے، یہ اُن کے بھائی بند ہوں گے۔ ہانز جس کے ساتھ وہ سارا سال برفوں پر رہا قیصر جیگرس کا باشندہ تھا اور جب وہ دونوں مل کر اُس لمبی وادی میں، لکڑیاں چیرنے والے کارخانے سے پرے، خرگوشوں کا شکار کھیلنے گئے تو ہانز نے پیوبیو کی جنگ، پرٹیکا اور آسالون کے حملوں کے واقعات سنائے تھے۔ لیکن اِن کے متعلق بھی اُس نے آج تک ایک لفظ نہ لکھا۔ اور ان کے علاوہ اُس نے مانٹی کارنو، سیٹ کاموم اور آرسائیڈو کے متعلق بھی کبھی کچھ نہیں لکھا۔

وورل برگ اور آرل برگ میں اُس نے کتنی سردیاں گذاریں؟ سردیوں کے چار موسم۔ پھر اسے وہ شخص یاد آیا جو ایک لومڑی بیچنا چاہتا تھا۔ اُن دنوں وہ بلوڈنز میں تحفے خریدنے کے لئے گئے تھے۔ خوشی سے گانے گنگناتے ہوئے اُس برف پر سے پھسلنے کا کتنا لطف آتا تھا۔ اور پھر آخری قطعہ گذر کر یکدم سیدھی ڈھلان پھر تین موڑ مڑ کر جوہڑ کے پار برف سے ڈھکی ہوئی سڑک پر آن پہنچنا جو سرائے کی پشت کی طرف تھی۔ سارے بندھن ڈھیلے کر کے لمبی

کلہاڑی اُتار کر سرائے کی چوبی دیوار کے سہارے رکھ دیا۔ کھڑکی میں لیمپ کی روشنی نظر آئی اور سرائے کے اندر دھواں اور تازہ شراب کی بُو اور گرمی اندھیرا کارڈین کی سُریلی آواز۔

"ہم پیرس میں کس جگہ ٹھہرے تھے؟" اُس نے اُس عورت سے پوچھا جو کپڑے کی کرسی پر اس کے پاس بیٹھی تھی۔ اب تو وہ افریقہ میں تھے۔

"کریلان میں۔ تمہیں تو اچھی طرح یاد ہونا چاہیئے۔"

"مجھے یاد کیوں ہونا چاہیئے؟"

"اس لیئے کہ ہم ہمیشہ وہیں ٹھہرا کرتے تھے۔"

"نہیں، ہم ہمیشہ تو وہاں نہیں ٹھہرتے تھے۔"

"ہاں وہیں، اور سینٹ جرمین کے پیولین ہنری کوارٹر میں۔ تم کہا کرتے تھے کہ مجھے اس جگہ سے عشق ہے۔"

"عشق گوبر کا ایک ڈھیر ہے اور میں وہ مرغا ہوں جو اس پر چڑھ کر بانگ دیا کرتا ہے۔"

"اگر کسی کو رخصت ہونا ہو تو کیا یہ بہت ہی ضروری ہے کہ وہ اپنے پیچھے ہر چیز کو برباد کر کے جائے؟ میرا مطلب ہے کہ کیا ہر چیز سے قطع تعلق کر لینا ضروری ہے، گھوڑے کو مار دینا چاہیئے اور بیوی کو بھی؟ گھوڑے کی زین کو جلا دینا چاہیئے؟ اور زرہ کو بھی"؟

"ہاں، تمہاری کمبخت دولت میری زرہ تھی۔"

"ایسا نہ کہو۔"

"بہت اچھا۔ اب نہ کہوں گا میں تمہیں اذیت دینا نہیں چاہتا۔"

"اب کیا فائدہ۔ اب تو تیر کمان سے نکل چکا۔"

"بہت اچھا، میں تمہیں اذیت دیتا چلا جاؤں گا۔ اس میں زیادہ لطف آتا ہے۔ تمہارے ساتھ صرف ایک بات کا مجھے لطف آتا تھا۔ لیکن اب میں وہ کر نہیں سکتا۔"

"یہ غلط ہے۔ تمہیں اور بھی بہت سی باتیں پسند تھیں۔ اور جو کچھ تم چاہتے تھے، میں تو وہی کچھ کرتی رہی۔"

"خدا کے لئے شیخی نہ بگھارو۔"

اس نے عورت کی طرف دیکھا تو وہ رو رہی تھی۔

"سنو، کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں، ایسا کرنا کوئی مذاق ہے؟ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں ایسا کیوں کر رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ میں اپنے آپ کو اس لئے مار رہا ہوں کہ تم زندہ رہو، جب ہم نے گفتگو شروع کی ہے۔ تو میں بھلا چنگا تھا۔ ایسی باتیں کرنے کا مجھے وہم و گمان بھی نہ تھا۔ اور اب میں مرغابی کی طرح مخبوط الحواس ہو رہا ہوں۔ اور امکان بھر تمہیں دکھ دے رہا ہوں۔ پیاری، تم میری باتوں پر مطلق کوئی دھیان نہ دو۔ مجھے تم سے محبت ہے سچی محبت۔ تم خود بھی جانتی ہو۔ میں نے آج تک کسی سے اتنی محبت نہیں کی جتنی تم سے کرتا ہوں۔"

جن دروغ بافیوں سے وہ اپنا حلوا مانڈا چلایا کرتا تھا وہی اس نے پھر شروع کر دیں۔

"تم کتنے اچھے ہو!"

"تم کتیا ہو، مالدار کتیا۔ یہ ہے نہ شاعرانہ بات۔ آج میری طبیعت شاعری پہ آمادہ ہے۔ سڑی ہوئی گندہ شاعری، بے ہودہ، فضول شاعری۔"

"چپ رہو۔ میری شیطان بننے کی کیا ضرورت ہے؟"

"میں کوئی چیز چھوڑنا نہیں چاہتا۔ میں سب کچھ جلا کر برباد کر دینا چاہتا ہوں۔"

اب شام ہو چکی تھی اور وہ کچھ دیر کے لئے سو بھی گیا تھا۔ آفتاب پہاڑیوں کے پیچھے جا چکا تھا اور ساری وادی میں سائے پھیل چکے تھے۔ چھوٹے چھوٹے چوپائے کیمپ کے نزدیک سر جھکائے اور دموں کو ادھر اُدھر ہلاتے ہوئے چر رہے تھے۔ اُس نے دیکھا کہ وہ جنگل سے پرے پرے رہتے ہیں۔ وہ جانور اب زمین پر نظر نہ آتے تھے بلکہ سب کے سب درخت پر بیٹھے ہوئے تھے اب تو اور بھی بہت سے جمع ہو گئے تھے۔ اس کا ذاتی ملازم بستر کے پاس ہی بیٹھا تھا۔

"میم صاحب شکار کے لئے گئے ہیں۔ بوانا کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔"

"نہیں۔"

وہ شکار کے لئے گئی تھی۔ اور چونکہ وہ جانتی تھی کہ اُسے شکار کا بڑا شوق ہے وہ کافی دور نکل گئی تاکہ اس کی نظروں سے اوجھل رہے اور وادی کے سکوت میں خلل نہ پڑے۔ اُس نے سوچا کہ وہ کتنی محتاط ہے۔ جو کچھ وہ جانتی ہے، یا پڑھتی ہے یا سنتی ہے۔ اس کا ہمیشہ خیال رکھتی ہے۔ اس میں اُس بے چاری کا کیا قصور ہے کہ جب میں اُس کے پاس گیا تو پہلے ہی سے ختم ہو چکا تھا۔ اُسے کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ جو کچھ میں نے اُس سے کہا سب جھوٹ تھا۔ میں تو اپنی عادت سے مجبور تھا۔ مجھے آرام و آسائش کی ضرورت تھی۔ جب میں سچ بولا کرتا تھا تو عورتیں میری اتنی پروا نہ کرتی تھیں۔

جھوٹ بول کر میں زیادہ کامیاب رہتا۔

میں اس لئے جھوٹ نہ بولتا تھا کہ اب سچ کہنے والی کوئی بات ہی باقی نہ تھی میں نے اپنی مزے کی زندگی گذار رہی تھی اور وہ ختم ہو گئی تھی۔ اور پھر میں مختلف لوگوں کے ساتھ مزید روپے حاصل کر کے پرانی دیکھی بھالی جگہوں میں سے بہترین جگہوں میں گھومتا رہا اور کچھ نئی جگہوں میں بھی۔

اگر سوچا نہ جائے تو ہر چیز کتنی حیرت خیز معلوم ہوتی ہے۔ میرے اندرونی اعضاء مضبوط تھے۔ اس لئے دوسروں کی طرح میرے پرخچے نہ اُڑے۔ اور میں نے ایسا وطیرہ اختیار کر لیا۔ جیسے مجھے اپنے پرانے کام کی اب پرواہ نہیں رہی۔ حالانکہ میں اب اسے کرنے کے قابل ہی نہ رہا تھا لیکن اپنے دل میں یہی سوچا کرتا تھا کہ میں ان لوگوں کے حالات بھی لکھوں گا ان امیرالامرا لوگوں کے حالات ایسے جیسے میں خود ان میں سے نہیں ہوں بلکہ ان کے ملک میں آکر ان کی جاسوسی کر رہا ہوں۔ میں یہاں سے جا کر ان کی سب کرتوتیں ظاہر کر دوں گا۔ اور ایک دفعہ تو میں یہ ثابت کر دوں گا کہ یہ کچا چٹھا اُس شخص نے لکھا ہے جو ان کے اندرون خانہ تک سے واقف تھا۔ لیکن میں کچھ بھی نہ لکھ سکا۔ کیونکہ بیکاری اور آسائش کا ہر دن مجھے اپنی کاموں میں مشغول رکھتا رہا جن سے مجھے نفرت تھی۔ میری صلاحیتیں کند ہوتی رہیں۔ اور میرا جوش کار کو ٹھنڈا پڑتا گیا۔ اور آخر میں نے کچھ بھی نہ کیا۔ جن لوگوں کو میں جانتا تھا اب وہ بڑی عیش و آرام کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ افریقہ وہ جگہ ہے جہاں میں نے اپنی زندگی کے بہترین دن گذارے ہیں۔ اور میں ایک دفعہ پھر اُس زندگی کو نئے سرے سے شروع کرنے کے لئے یہاں آیا تھا۔ اس سفر میں آسائش کی کمی رہی۔ کوئی دقت پیش نہ آئی لیکن عیش و آرام کی بھی کوئی گھڑی نصیب نہ ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ مجھے اچھی

زندگی کی عادت ہو جائے گی۔ جس طرح پہلوان لوگ اپنے جسم کی چربی کم کرنے
کے لئے پہاڑی علاقے میں چلے جاتے ہیں، میرا خیال تھا کہ میری رُوح
پر جو چربی چھا رہی ہے اس طرح پگھل جائے گی۔
یہ بھی تو اس زندگی کو پسند کرتی تھی۔ نئے مناظر، نئے لوگ اور نئی
چیزوں سے بڑی لطف اندوز ہوتی تھی۔ اور میرا خیال تھا کہ ماحول کی اس
تبدیلی سے مجھ میں بھی کام کرنے کی روح پیدا ہو جائے گی اور اب اگر یہ
زندگی اس کا انجام ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ انجام آن پہنچا ہے، تو
اب مجھے کمر ٹوٹے سانپ کی طرح اپنے آپ کو ہی نہ کاٹنا چاہیئے۔ اس
میں اس عورت کا کیا قصور ہے۔ اگر یہ نہ ہوتی تو کوئی اور ہوتی۔ اگر
زندگی میں میرا گزارہ جھوٹ پر رہا ہے تو موت کے وقت بھی اس کا

اُس نے پہاڑیوں سے پرے بندوق چلنے کی آواز سُنی
یہ امیر کُتیا، یہ مہربان خادمہ، میری صلاحیتوں کو برباد کرنے والی یہ
عورت بڑا اچھا نشانہ لگاتی ہے۔ نہیں، غلط ہے۔ میں نے اپنی صلاحیتوں
کو خود ہی برباد کیا ہے۔ اس بے چاری کو متہم کیوں کیا جائے جو میری اتنی
خاطر داری کرتی ہے۔ میں نے اپنی صلاحیتوں کو خود برباد کیا ہے، انہیں
بے کار رکھ کر، اپنے آپ سے غداری کر کے، شراب پی پی کر، سستی سے،
کاہلی سے، گھمنڈ سے، غرور سے، تعصب سے، دھوکے اور فریب سے،
یہ میں نے کیا کہا۔ شاید اپنی کتاب زندگی کی فہرست مضامین پڑھ ڈالی۔
مجھ میں صلاحیت ہی کونسی تھی۔ اور اگر یہ صلاحیت تھی تو میں نے
اسے مالِ تجارت سمجھ رکھا تھا۔ میری صلاحیتوں کے عملی نتائج کیا ہیں۔

میں تو یہی سوچتا رہا کہ یہ کر سکتا ہوں، وہ کر سکتا ہوں - اور بجائے قلم سے
روزی کمانے کے میں نے دوسرے ذرائع اختیار کر لیے - اور یہ بھی کتنی عجیب
بات ہے کہ جب کبھی میں ایک عورت کو چھوڑ کر کسی دوسری سے آشنائی
پیدا کرتا، تو وہ پہلی سے زیادہ مالدار ہوتی - اور اب جب کہ میرے دل
میں محبت کا شائبہ تک موجود نہیں - جب میں اس عورت سے سراسر جھوٹ
بول رہا ہوں، جس کے پاس پہلی تمام عورتوں کے مقابلے میں زیادہ دولت
ہے جس کا ایک خاوند بھی تھا اور بچے بھی، جس نے کئی مردوں سے عشق کیا
لیکن پھر بھی غیر مطمئن ہی رہی، جو مجھ سے اس لئے محبت کرتی ہے کہ میں ایک
مصنف ہوں، ایک مرد ہوں، اچھا ساتھی ہوں، ایک ایسی قیمتی شے ہوں
جس پر قبضہ کرنے سے اسے فخر محسوس ہوتا ہے - کتنی عجیب بات ہے
کہ اس سے محبت نہ کرتے ہوئے اور سراسر جھوٹ بولنے کے باوجود میں
اسے اس کی دولت کے بدلے میں وہ سب کچھ دے رہا ہوں جو شاید سچی محبت
کرنے پر بھی نہ دے سکتا -

اگر پاداشِ عمل کے متعلق سوچا جائے تو ہم سب گردن زدنی
ہیں - لیکن ہم اپنی گذر اپنی اپنی صلاحیتوں کے بل پر کرتے ہیں - میں
اپنی قوتِ حیات کو ایک نہ ایک صورت میں بیچتا ہی رہا ہوں - زندگی
بھر میرا یہی کام رہا ہے - اور یہ عجیب بات ہے کہ جب ہمارے جذبات
شامل نہیں ہوتے تو ہم روپے کے عوض میں ایسا مال دیتے ہیں جس سے
گاہک مطمئن ہو جاتا ہے - یہ بات مجھے معلوم تو ہو گئی ہے لیکن اب
میں اس کے متعلق کچھ نہ لکھوں گا - ہاں، میں اسے ہرگز نہ لکھوں گا
حالانکہ یہ بات اس قابل تھی کہ اسے لکھا جاتا -

اب وہ سامنے نظر آرہی تھی اور میدان کو قطع کرتے ہوئے کیمپ کی طرف چلی آتی تھی۔ اُس نے اونچے بوٹ پہنے ہوئے تھے اور رائفل اُٹھائے ہوئے تھی۔ دو لڑکوں نے ایک موٹی لکڑی سے ہرن لٹکا کر کندھوں پر اُٹھا رکھا تھا اور اس کے پیچھے پیچھے چلے آرہے تھے۔ اُس نے سوچا یہ اب بھی کافی خوبصورت ہے اور اس کا جسم ---- یہ حسین تو نہیں لیکن اس کے چہرے کے خدوخال مجھے پسند ہیں۔ پڑھنے کا اسے بے انتہا شوق ہے۔ گھوڑے کی سواری اور شکار کو بھی پسند کرتی ہے اور پیتی بہت زیادہ ہے۔ اس کا خاوند اُس وقت مرا جب وہ ابھی جوان ہی تھی، چنانچہ اس نے اپنے دو ننھے ننھے بچوں کی عمدہ پرداخت شروع کر دی۔ لیکن اُنہیں اس کی ضرورت نہ تھی۔ وہ اس کے طویلوں اور گھوڑوں اور شراب کی بوتلوں سے گھبرائے گھبرائے رہتے تھے۔ وہ رات کے کھانے سے پہلے مطالعے کی عادی تھی اور پڑھتے ہوئے سکاچ وسکی اور سوڈا پیتی جاتی تھی۔ کھانے کے وقت تک وہ کافی پی چکی تھی اور پھر کھانے کے ساتھ ایک اور بوتل پی کر اسے اتنا نشہ ہو جاتا تھا کہ نیند آجائے۔

یہ عشق بازی شروع کرنے سے پہلے کی بات ہے۔ اور پھر عشاق کے دور میں اُسے اتنی شراب خوری کی ضرورت نہ رہی تھی۔ کیونکہ اب سونے کے لئے اسے نشے کی ضرورت نہ پڑتی تھی۔ لیکن وہ عاشقوں سے بھی اُکتا گئی۔

وہ اپنے خاوند سے کبھی نہ اُکتائی تھی۔ لیکن ان لوگوں سے وہ بڑی اُکتا گئی۔۔۔

اس کے بعد اس کا ایک بچہ ہوائی جہاز کے حادثے میں مر گیا۔ اس کے

بلکہ اسے عشاق سے رغبت نہ رہی۔ شراب اسے بے ہوش نہ کر سکتی تھی۔ اس لیے اس نے ایک نئی زندگی کا آغاز کیا۔

یکایک اسے اپنی تنہائی سے ڈر آنے لگا لیکن اسے ایسے شخص کی تلاش تھی جو قابل عزت ہو۔

یہ نیا معاشقہ بڑی سادگی سے شروع ہوا۔ جو کچھ میں لکھتا تھا اسے مرغوب تھا اور میری زندگی بھی اسے بے حد پسند تھی۔ یہ سمجھتی تھی کہ میں جو چاہتا ہوں کرتا ہوں۔ وہ مدارج جن سے گذر کر اس نے مجھے حاصل کیا اور وہ طریقہ جس سے یہ میری محبت میں گرفتار ہوئی۔ ایک بتدریج ترقی تھی جس میں اس نے اپنی زندگی کو ایک نئے سانچے میں ڈھال لیا اور میں نے بھی سابقہ زندگی میں سے جو کچھ بچ رہا تھا اُس کا سودا کر لیا۔

اور میں نے یہ سودا اپنے تحفظ کے لئے کیا، اور اپنے آسائش و آرام کے لئے۔ اس سے کیسے انکار ہو سکتا ہے۔ اور اس کے علاوہ اور کوئی وجہ ہے بھی نہیں۔ کم از کم مجھے تو اور کوئی وجہ نہیں سوجھتی۔ جو کچھ میں چاہتا اس پر یہ روپیہ خرچ کرنے کو تیار رہتی۔ اس کا مجھے علم ہے۔ کمبخت کیسی اچھی عورت ہے۔ میں کسی عورت کی طرح کے ساتھ بھی سو سکتا ہوں۔ بلکہ اسی کے ساتھ کیونکہ یہ بڑی دولت مند ہے، اس کی طبیعت بھی اچھی ہے۔ قدر شناس بھی ہے اور اس لئے بھی کہ یہ لڑائی جھگڑا نہیں کرتی۔ اور اب اس زندگی کی جو اس نے نئے سرے سے بناتی تھی۔ میعاد ختم ہو رہی ہے۔ اس لئے کہ میں نے اپنے زخم پر آیوڈین نہ لگائی۔ یہ ایک کانٹے کی ہلکی سی خراش تھی جو مجھے اس وقت لگا تھا جب میں ہرنوں کے ایک غول کی تصویر لینے کے لئے بڑھ رہا تھا۔ وہ کس طرح کھڑے تھے! اپنے سر اٹھائے

اور نتھنوں سے ہوا کو سونگھتے ہوئے۔ انہوں نے کان یوں پھیلا رکھے تھے، جیسے ہلکی سے ہلکی آواز پر بھی ایک دم جنگل کی طرف دوڑ پڑیں گے۔ اور وہ سچ مچ تصویر لینے سے پہلے ہی چوکڑیاں بھرتے بھاگ نکلے۔

وہ اب نزدیک آ پہنچی تھی۔

اُس نے چارپائی پر سے سر کو ذرا موڑ کر اس کی طرف دیکھا اور "ہیلو" کہہ کر اس کا استقبال کیا۔

"میں نے ایک ہرن شکار کیا ہے"۔ اُس نے کہا "تمہارے لئے بڑا اچھا شوربا بنے گا۔ اور میں تھوڑا سا آلوؤں کا بھرتہ بھی بنوا دوں گی۔ تمہاری طبیعت اب کیسی ہے؟"

"بہت اچھی۔ ہے نا؟"

"کتنی اچھی بات ہے۔ مجھے پہلے ہی خیال تھا تمہاری طبیعت سنبھل جائے گی۔ جب میں گئی تو تم سو رہے تھے؟"

"مجھے اچھی طرح نیند آ گئی۔ کیا تم بہت دور گئی تھیں؟"

"نہیں تو۔ صرف ان پہاڑیوں کے پیچھے۔ میں نے اس ہرن پر بڑا اچھا نشانہ کیا۔"

"تمہارا نشانہ بہت اچھا ہے۔"

"مجھے یہ جگہ بڑی پسند ہے۔ مجھے افریقہ سے محبت ہے۔ سچ مچ اگر تم اچھے ہو جاؤ۔ تو کتنا لطف آئے تمہارے ساتھ شکار کرنے میں کتنا مزہ آتا تھا۔ یہ علاقہ مجھے بے حد پسند ہے۔"

"مجھے بھی بڑا پسند ہے۔"

"پیارے! یہ دیکھ کر مجھے کتنی خوشی ہوئی ہے کہ تمہاری طبیعت اب

اب تم اُس طرح کی باتیں پھر کبھی نہ کرنا۔ نہیں کروگے ناں؟ وعدہ کرو"

"اب نہ کروں گا۔ مجھے یاد بھی نہیں۔ میں نے کیا کچھ کہا تھا۔"

"تم مجھے تباہ کرنا نہیں چاہتے تا، کہو نہیں؟ میں اب ایک۔ ادھیڑ عمر کی عورت ہوں جسے تم سے پیار ہے۔ جو کچھ تم چاہتے ہو وہی کچھ کرتی ہوں۔ میں اِس سے پہلے بھی دو تین مرتبہ تباہ ہو چکی ہوں۔ کیا تم مجھے ایک دفعہ اور تباہ کرنا چاہتے ہو۔ کیوں، کروگے؟"

"ہاں۔ لیکن بستر میں۔"

"ہاں، وہ تباہی بڑی مزے کی ہوتی ہے۔ ہماری تخلیق ہی ایسی ہوئی ہے کہ اُس تباہی سے لطف اندوز ہوتے رہیں۔ ہوائی جہاز کل یہاں پہنچ جائے گا۔"

تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"مجھے یقین ہے۔ اب اسے پہنچنا ہی ہے۔ لڑکوں نے لکڑی اکٹھی کر رکھی ہے۔ اور آگ لگانے کے لئے سوکھی گھاس بھی اس میں رکھ دی ہے۔ میں آج پھر وہاں گئی تھی اور ساری تیاری دیکھ آئی ہوں۔ جہاز کے اُترنے کے لئے کافی ہموار جگہ موجود ہے۔ اور دونوں سروں پر نشان لگا رکھے ہیں۔"

"تمہیں کس بات سے یہ خیال پیدا ہوا کہ ہوائی جہاز کل آجائے گا؟"

"مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور آئے گا۔ اب تو کافی دن گذر چکے ہیں۔ پھر شہر پہنچ کر وہ تمہاری ٹانگ کا علاج کریں گے اور ہم تباہی سے ... اُٹھائیں گے۔ لیکن پھر وہ خوفناک باتیں نہ کرنا۔"

"تھوڑی سی شراب نہ پئیں؟ سورج اب ڈھل چکا ہے"

"کیا شراب تمہارے لئے مناسب ہے؟"

"میں تو پیوں گا۔"

"اچھا تو آؤ اکٹھے پئیں۔ مولو! وہ وسکی اور سوڈا لاؤ"

"تم مچھروں سے بچاؤ کے لئے اپنے لمبے بوٹ پہن لو۔"

"میں ذرا نہا لوں۔ پھر پہن لوں گی۔"

تاریکی آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی اور وہ دونوں پی رہے تھے۔ اندھیرا پڑنے سے ذرا پہلے کہ اس میں نشانہ نہ کیا جا سکتا تھا۔ ایک چرخ پہاڑ کی طرف جاتے ہوئے کھلی جگہ سے گذرا۔

"یہ حرامی ہر رات یہاں سے گذرتا ہے۔" مرد نے کہا "میں اسے پچھلے دو ہفتوں سے روزانہ دیکھ رہا ہوں۔

"یہ وہی ہے جو رات کو شور مچایا کرتا ہے۔ میں تو اس کی پروا نہیں کرتی۔ بڑا گندہ جانور ہے۔"

وہ دونوں اکٹھے پی رہے تھے۔ اس وقت اسے کوئی تکلیف نہ تھی سوائے اس کے کہ ایک ہی رُخ لیٹنا پڑتا تھا۔ حبشیوں نے آگ جلا رکھی تھی اور اس کے سائے خیموں پر ناچ رہے تھے۔ اس خوشگوار فرمانبرداری کی زندگی کے لئے اس کی طبیعت پھر کچھ رضامند سی ہوتی جا رہی تھی۔

یہ مجھ سے کتنا اچھا سلوک کرتی ہے۔ میں نے تیسرے پہر اس کے ساتھ بڑی سختی اور بے انصافی کی تھی یہ کتنی نیک عورت ہے۔

عین اس وقت اسے احساس ہُوا کہ میں تو مر رہا ہوں۔ یہ احساس اُسے اِس طرح ہوا جیسے کوئی چیز حملہ کرتی ہے۔ ایسے نہیں جیسے پانی یا ہوا کا تھپیڑا پڑتا ہے بلکہ اس طرح جیسے کوئی بدبودار خلاء ہو۔ اور عجیب بات یہ کہ اُس خلا کے کنارے پر جیسے چرخ گذر رہا ہو۔

"کیا بات ہے ہیری؟" عورت نے پوچھا

"کچھ نہیں۔ تم دوسری طرف سرک جاؤ، جس طرف سے ہوا آتی ہے"

"مولو نے تمہاری پٹی بدلی تھی؟"

"ہاں لیکن اب میں صرف پورک استعمال کر رہا ہوں۔"

"تمہاری طبیعت کیسی ہے؟

"کچھ ڈگمگا رہی ہے۔"

"میں ذرا نہانے جا رہی ہوں۔ ابھی آجاؤں گی۔ ہم کھانا اکٹھے کھائیں گے۔ اور اس کے بعد تمہاری چارپائی اندر لے جائیں گے۔"

اُس نے اپنے دل میں سوچا، اچھا ہی ہوا ہم نے جھگڑنا بند کر دیا۔ میں نے اس عورت سے کبھی زیادہ جھگڑا نہیں کیا حالانکہ جن عورتوں سے میں نے اس سے پہلے معاشقہ کیا ہے، ان سے اتنا جھگڑا کرتا رہا ہوں کہ آپس کے تعلقات ہمیشہ مردہ ہو جایا کرتے تھے۔ میں نے محبت بھی بڑی شدت سے کی ہے اور اس کا معاوضہ بھی بہت زیادہ طلب کیا ہے، اور یہ سب کچھ آخر ختم ہو گیا۔

اور جب اُس دفعہ میں پیرس سے چلتے وقت اُس عورت سے جھگڑ کر قسطنطنیہ چلا گیا۔ تو بڑی تنہائی محسوس کی۔ سارا وقت میں نے عورتوں سے دل بہلانے میں صرف کر دیا لیکن تنہائی کا احساس کسی طرح کم نہ ہُوا۔ بلکہ پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گیا۔ اُس وقت میں نے اُسے پہلا خط لکھا اور ڈاک میں بھیج بھی دیا۔ خط میں میں نے صاف صاف لکھ دیا کہ میں اُس کی یاد کو کسی طرح دل سے محو نہیں کر سکا۔ . . . ایک روز ریجنس کے سامنے ایک عورت کو دیکھ کر مجھے خیال ہوا کہ وہی ہے۔ میرا دل دھک سے رہ گیا اور بے ہوشی طاری ہونے لگی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے بھاگا۔ میں اس بات سے

ڈر رہا تھا کہ اگر آگے بڑھ کر دیکھا اور وہ نہ نکلی تو پھر میرا کیا حال ہوگا۔ میں نے
اُسے بھلانے کے لئے کئی عورتوں کے ساتھ رات بسر کی لیکن اُس کی طلب
اور بڑھ گئی۔ میرے پاس اُس کی محبت کا کوئی علاج نہ تھا اس لئے میں اس
کی ہر خطا معاف کرنے کو تیار تھا۔ میں نے یہ خط اپنے ہوش و حواس میں کلب
میں بیٹھ کر لکھا اور نیویارک بھیج دیا۔ اس میں لکھا تھا کہ وہ مجھے پیرس میں
میرے دفتر میں ملے۔ اس رات مجھے اس کی یاد نے اتنا ستایا کہ دل بیٹھنے
لگا میں گھومتا ہوا ٹاکسیم جا نکلا اور وہاں سے ایک لڑکی اس خیال سے ساتھ
لے لی کہ کھانا اکٹھے کھائیں گے۔ کھانے کے بعد میں اُسے ایک جگہ ناچنے
کے لئے لے گیا لیکن وہ ناچنا نہ جانتی تھی۔ میں نے اسے چھوڑ کر ایک پھوہڑ
سی گرم طبیعت ارمنی لڑکی کو پکڑ لیا لیکن وہ اپنا پیٹ میرے ساتھ اتنے زور
سے رگڑتی رہی کہ میرا جسم چھل گیا۔ میں نے اس لڑکی کو انگریزی توپخانے کے ایک
افسر سے لڑائی مول لے کر چھینا تھا۔ توپچی غصے سے بھر گیا اور مجھے باہر
نکل کر لڑنے کے لئے للکارا۔ ہم دونوں پتھریلی گلی میں تاریکی میں لڑتے
رہے۔ میں نے دو گھونسے اس کے جبڑوں پر جمائے لیکن وہ گرا نہیں۔ توپچی
نے ایک گھونسہ میرے پیٹ میں اور دوسرا آنکھ پر مارا۔ میں نے بائیں ہاتھ
کی رسید کی تو وہ مجھ سے چمٹ گیا اور میرے کوٹ کا بازو پھاڑ کر الگ
کر دیا۔ میں نے دو مکے اس کے کان کے پیچھے مارے اور پھر دائیں ہاتھ
سے دھکیل کر اُسے الگ کیا۔ توپچی سر کے بل پتھروں پر گرا ہی تھا۔ کہ
ملٹری پولیس کے آنے کا شور ہوا۔ میں لڑکی کو لے کر بھاگ کھڑا ہوا۔ ہم
ٹیکسی میں بیٹھ کر باسفورس کے کنارے رملی حصار جا پہنچے۔ تھوڑی دیر ادھر
اُدھر گھوم کر پھر باہر نکل آئے۔ رات ٹھنڈی اور تاریک تھی۔ ہم بستر پر

لیٹ گئے۔ وہ واقعی پکے ہوئے پھل کی طرح تیار تھی۔ اس کی جلد کتنی نرم تھی اور اس کا جسم گلاب کی پتیوں کی طرح اور رس دار۔ ابھی سورج کی پہلی کرن ہی نمودار ہوئی تھی کہ میں اسے سوتا چھوڑ کر نکل آیا۔ دن کی روشنی میں وہ کتنی بھدی نظر آتی تھی۔ بے بازو کا کوٹ اٹھائے اور زخمی آنکھ کے ساتھ میں پیرا پیلیس کی طرف نکل آیا۔

اُسی رات میں اناطولیہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ مجھے یہ سفر بھی یاد ہے سارا دن میں گھوڑے پر سوار پوست کے کھیتوں میں سے گزرتا رہا جنہیں افیون بنانے کے لئے بویا جاتا ہے۔ انسان اس ماحول میں اپنے آپ کو کتنا عجیب و غریب محسوس کرتا ہے۔ سب فاصلے غلط معلوم ہوتے ہیں۔ اسی جگہ قسطنطین کی نئی فوجوں نے حملہ کیا تھا۔ وہ جنگ کے طریقوں سے بالکل ناواقف تھے۔ توپ خانے نے اپنی فوجوں ہی کے ٹکڑے اُڑا دیئے۔ جسے دیکھ کر مشاہدہ کرنے والا برطانوی افسر بچوں کی طرح رونے لگ گیا۔

اُس روز میں نے پہلی دفعہ دیکھا کہ مردوں کی لاشیں ناچ کرنے والے سفید لہنگے پہنے ہوئے ہیں، اور الٹی جوتیوں پر پھندے لگے ہوئے ہیں ترک بڑے عزم و استقلال سے، بھدّی سی چال چلتے بڑھے چلے آتے تھے۔ سفید لہنگوں والے سپاہی اُٹھ بھاگے اور اُن کے پیچھے پیچھے اُن کے افسر بھگوڑوں کو گولیاں مارتے ہوئے خود بھی بھاگ رہے تھے۔ میں اور مشاہدہ کرنے والا برطانوی افسر بھی بھاگنے لگے، یہاں تک کہ میرے پھیپھڑوں میں درد ہونے لگا اور منہ کا مزہ ایسا کسیلا ہو گیا جیسے منہ میں تانبے کے سکے پڑے ہوں۔ ہم تھوڑی دیر کے لئے ٹیلوں کی اوٹ میں کھڑے ہو گئے لیکن ترک اُسی بھدّی چال سے بڑھے چلے آ رہے تھے۔ اس کے بعد میں نے ایسی

باتیں دیکھیں جن کا میں تصور بھی نہ کرسکتا تھا اور پھر اس کے بعد اس سے بھی بدتر باتیں۔ چنانچہ جب میں پیرس پہنچا تو ان کا ذکر تک نہ کرسکتا تھا اور نہ ان کے متعلق کچھ سننا برداشت ہوتا تھا۔ اور جب میں کافے میں اُس امریکی شاعر کے پاس سے گذرنے لگا جس کے سامنے طشتریوں کا ایک ڈھیر لگا ہوا تھا اور جس کے آلو جیسے چہرے سے بیوقوفی ٹپکتی تھی تو وہ ایک رومانوی کے ساتھ ڈاڈا کی تحریک کے متعلق کچھ باتیں کررہا تھا۔ رومانوی نے اپنا نام ٹرسٹن ٹزارا بتایا تھا۔ وہ ہر وقت ایک آنکھ کا چشمہ لگائے رہتا اور اس کے سر میں درد بھی تھا۔

میرا جنون اب ختم ہو چکا تھا۔ بیوی کے ساتھ میری صلح تھی اور میں اس سے محبت بھی کرنے لگ گیا تھا۔ دفتر والوں نے میرے خطوط گھر پر ہی بھیج دیئے ایک دن صبح ہی صبح ملازم میری ڈاک کشتی میں رکھ کر لایا۔ اس میں اُس خط کا جواب بھی تھا جو میں نے اس لڑکی کو لکھا تھا۔ تحریر پہچان کر میرا جسم ٹھنڈا پڑ گیا اور میں نے اسے ایک دوسرے خط کے نیچے چھپانے کی کوشش کی۔ میری بیوی نے پوچھا " پیارے، یہ کس کا خط ہے؟" اور بس محبت کی ابتداء ہوتے ہوتے انجام بھی آپہنچا۔

ان عورتوں کے ساتھ وہ عیش و مسرت کے دن اور لڑائی جھگڑوں کی سب داستانیں مجھے اب بھی یاد ہیں۔ یہ عورتیں ہمیشہ بہترین جگہوں پر لڑا کرتی تھیں۔ عجیب بات ہے کہ یہ ہمیشہ اُس وقت لڑتی تھیں جب میں انتہائی لطف محسوس کررہا ہوتا تھا۔ میں نے ان کے متعلق بھی کبھی کوئی بات نہ لکھی کیونکہ میں کسی کو دُکھ نہ پہنچانا چاہتا تھا۔ اُس وقت یہ محسوس ہوتا تھا کہ ان باتوں کے متعلق بہت کچھ لکھ سکتا ہوں اور میرا خیال تھا کہ

آخر کار ان کے متعلق بھی کچھ نہ کچھ ضرور لکھوں گا۔ بہت سی باتیں لکھنے والی تھیں۔ میں نے دنیا کو بدلتے ہوئے دیکھا، صرف واقعات کی بات نہیں۔ حالانکہ میں نے واقعات بھی بہت دیکھے ہیں اور لوگوں کا بھی مطالعہ کرتا رہا ہوں۔ میں نے لوگوں میں بڑی پُراسرار تبدیلیاں دیکھی ہیں اور جانتا ہوں کہ مختلف حالات میں ان کے احساسات کیا ہوتے ہیں۔ میں انہیں لوگوں میں رہا ہوں اور ان کا بڑا گہرا مطالعہ کرتا رہا ہوں۔ میرا فرض تھا کہ ان کے متعلق بھی کچھ لکھتا لیکن اب تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔

"اب طبیعت کیسی ہے؟" وہ غسل کر کے خیمے سے باہر آ رہی تھی۔

"ٹھیک ہے۔"

"اب کھانا کھاؤ گے؟" اُس کے پیچھے مولو تہہ ہونے والا میز اُٹھائے چلا آ رہا تھا اور دوسرا لڑکا کھانے کی پلیٹیں اٹھائے ہوئے تھا۔

"میں کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔"

"تم تھوڑی سی یخنی پی لو۔ تاکہ تمہاری طاقت قائم رہے۔"

"میں آج رات مر جاؤں گا۔ مجھے اب طاقت قائم رکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ہیری، خدا کے لئے یہ ڈرامائی اندازِ گفتگو چھوڑ دو۔"

"تمہاری ناک کو کیا ہوا ہے؟ آدھی ران تک میرا گوشت سڑ چکا ہے۔ جہنم میں ڈالو اس یخنی کو، کیا تم سمجھتی ہو کہ اس سے میں موت کو دھوکا دے لوں گا۔ مولو! وسکی اور سوڈا لاؤ۔"

"تھوڑی سی یخنی لے لو۔" اُس نے بڑی لجاجت سے کہا۔

"اچھا لاؤ۔"

یخنی بہت گرم تھی وہ اسے ٹھنڈا کرنے کے لئے ہاتھ میں پکڑے رہا۔ اور پھر ایک دم نگل گیا۔

"تم بڑی اچھی عورت ہو۔ میری باتوں کی طرف زیادہ دھیان نہ دیا کرو۔"

اُس نے عورت کے خوبصورت اور محبت آشنا چہرے کی طرف دیکھا جس کے حُسن میں شراب خودی سے کچھ ذرا سا فرق پڑ گیا تھا اور بستر کے لئے کچھ ذرا سی غیر موزونی بھی۔ لیکن شہر اور دیہات میں ایسی خوبصورت چھاتیاں اور ایسی لطیف رانیں اور ایسے سڈول ہاتھ کہاں دیکھنے میں آتے ہیں۔ پھر جونہی اس نے اس کے چہرے کی دلربا مسکراہٹ دیکھنے کیلئے نظریں اُٹھائیں اسے پھر موت کا احساس ہونے لگا۔ اس دفعہ وہ حملہ کر کے نہ آئی بلکہ ایک جھونکے کی طرح، جیسے ہوا کے جھونکے سے شمع کی لو طویل ہو جاتی ہے۔

"لڑکے کچھ دیر کے بعد میری مسہری یہیں درخت کے سہارے لگا دیں گے۔ اور الاؤ جلا دیں گے۔ میں آج خیمے میں نہ جاؤں گا۔ اس سے کوئی فائدہ بھی نہیں۔ آج رات مطلع صاف ہے۔ بارش کا امکان نہیں"

سو اس طرح موت آتی ہے، سرگوشیوں میں جنہیں ہم سُن بھی نہیں سکتے۔ اب آپس کے لڑائی جھگڑے بھی ختم ہو جائیں گے۔ یہ تو یقینی ہے۔ یہ تجربہ جو مجھے پہلی دفعہ حاصل ہونے والا ہے میں اس میں بدمزگی پیدا نہ ہونے دوں گا۔ شاید کوئی بدمزگی پیدا ہو جائے۔ انسان ہر چیز کو برباد کر دیتا ہے لیکن شاید میں نہ ہونے دوں گا۔

"اگر میں تمہیں کچھ لکھاؤں تو لکھ سکو گی؟"

"میں نے کبھی اِس کی تربیت تو نہیں لی۔"

"چلو جانے دو۔"

اس کے لئے اب وقت بھی کہاں تھا۔ اگرچہ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ایک ہی پیرے میں ساری اَن کہی کہانی بیان کریگا اُس جھیل کے کنارے پہاڑی پر لکڑی سے بنا ہُوا ایک مکان تھا جس پر سفیدی چمک رہی تھی۔ دروازے پر ایک کھمبے کے ساتھ گھنٹی لٹک رہی تھی جسے بجا کر سب کو کھانے کے لئے بلایا جاتا تھا۔ گھر کے پشت کی طرف کھیت تھے اور کھیت سے پرے جنگل تھا۔ لمبے لمبے درختانِ حُور مکان سے گوذی تک قطار میں کھڑے تھے۔ دوسرے درخت کنارے کے ساتھ ساتھ تھے۔ جنگل کے ساتھ ملی ہوئی ایک سڑک پہاڑیوں کی طرف جاتی جس کے کناروں سے میں بلیک بیری چُن چُن کر کھایا کرتا تھا۔ ایک دن اس لکڑی کے گھر میں آگ لگ گئی تو تمام بندوقیں جو انگیٹھی کے اُوپر کھونٹوں پر رکھی ہوئی تھیں، ساتھ ہی جل گئیں۔ اور پھر ان بندوقوں کی نالیاں، جن کے کندے جل چکے تھے اور گولیاں پگھل کر اندر ہی جم گئی تھیں اُس جلی ہوئی راکھ کے ڈھیر پر پڑی رہتیں جس سے صابن کے لئے تیزی تیار کی جاتی تھی۔ اور جب میں دادا سے پوچھتا کہ میں اِن بندوق کی نالیوں کے ساتھ کھیلوں، تو وہ جواب دیتا نہیں اِن بندوقوں کا مالک وہی تھا۔ پھر نہ اُس نے نئی بندوقیں خریدیں اور نہ کبھی شکار کھیلا۔ یہ مکان پھر نئے سرے سے لکڑی ہی سے بنایا گیا اور اس پر سفیدی بھی کی گئی۔ اس کے برآمدے سے حُور کے درختوں کی قطاریں بھی نظر آتیں اور جھیل بھی۔ لیکن اس میں بندوقیں کبھی نہ

آئیں۔ وہ بند و قیں جو پہلے اس کی دیواروں کی زینت تھیں، راکھ کے ڈھیر پر پڑی رہیں اور کسی نے اُنہیں ہاتھ نہ لگایا۔

جنگ کے بعد بلیک فارسٹ میں ہم نے ٹراؤٹ مچھلی کے شکار کے لئے ایک ندی ٹھیکے پر لی۔ ندی کی طرف جانے کے دو راستے تھے۔ پہلا راستہ ٹرائی برگ سے چل کر وادی اُتر کر، وادی کی سڑک کے اوپر سے گھوم کر جاتا تھا۔ سفید سفید سڑک پر دو رویہ درختوں کا سایہ تھا۔ پھر یہ اُس چھوٹی سڑک سے جا ملتا تھا جو پہاڑیوں میں سے ہو کر اور چھوٹے چھوٹے کھیتوں میں سے ہوتی ہوئی شوازر والڈ کے گھروں تک جا پہنچتی تھی، یہاں تک کہ ندی پر پہنچ جاتی تھی۔ یہاں ہم شکار کھیلا کرتے تھے۔

دوسرے راستے میں جنگل کی طرف سیدھی چڑھائی چڑھنا پڑتی تھی اور صنوبر کے جنگل سے گذر کر پہاڑ کی چوٹی کو عبور کرنا پڑتا تھا اور نیچے چراگاہ کی طرف اُتر کر پُل تک جا پہنچتے تھے۔ ندی کے کنارے کنارے برچ کے درخت تھے۔ یہ ندی تنگ لیکن صاف اور تیز رَو تھی اور جہاں پانی زمین کاٹ کر برچ کی جڑوں تک جا پہنچا تھا وہاں چھوٹے چھوٹے بھنور پڑتے تھے۔ ٹرائی برگ کے ہوٹل کا مالک خوب کاروبار کر رہا تھا۔ موسم نہایت خوشگوار تھا اور ہم آپس میں گہرے دوست بن گئے تھے۔ اگلے سال افراطِ زر کا دَور دورہ ہو گیا۔ اور اُس کی ساری کمائی کی اتنی وقعت نہ رہی کہ سامان خرید کر ہوٹل کو چلا سکتا۔ چنانچہ اس نے خودکشی کر لی۔

یہ سب باتیں لکھائی جا سکتی ہیں لیکن کونٹر سکارپ کی تصویر کیسے

دکھائی جائے جہاں گل فروش اپنے پھولوں کو گلی میں رنگا کرتے تھے۔ رنگدار پانی گلی میں لیس کے اڈے تک بہہ نکلتا، جہاں بڈھے مرد اور عورتیں شراب یا ٹھرا پی کر گھومتے رہتے۔ اور بچے جن کی ناک سردی کی وجہ سے بہتی رہتی، اور کالنے امیچور میں گندے پسینے کی بو۔ اور نکبت وفلاکت کے نظارے اور پیشہ ور رنڈیاں۔ وہ فرانسیسی لڑکی جس نے جمہوریہ فرانس کے ایک سپاہی کی دعوت اپنے مکان پر کی تھی۔ سپاہی کا خود جس میں گھوڑے کی دُم کے بال لگے ہوئے تھے، کرسی پر پڑا تھا۔ اس بڑے ہال کے پرلی طرف وہ لڑکی رہتی تھی جس کا خاوند سائیکل کی دوڑوں میں حصّہ لیتا تھا۔ ایک دن جب اس نے اخبار میں دیکھا کہ اس کا خاوند دوڑ میں تیسرے نمبر پر آیا ہے، تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ یہ اس کے خاوند کی پہلی کامیابی تھی۔ پہلے تو حیا سے اس کا رنگ سرخ ہو گیا اور پھر خوشی سے اُس کے آنسو نکل آئے۔ وہ زرد رنگ کا اخبار ہاتھوں میں پکڑے دوڑتی ہوئی سیڑھیوں پر چڑھ گئی۔ بال میورل کی مالک عورت کا خاوند ٹیکسی چلاتا تھا اور جب مجھے صبح ہی صبح کسی ہوائی جہاز پر جانا ہوتا تو وہ میرا دروازہ کھٹکھٹا کر مجھے جگا دیتا۔ پھر دونوں بیٹھ کر سفید شراب کا ایک ایک جام پیتے۔ میں اُن دنوں سارے ہمسایوں سے واقف تھا کیونکہ وہ سب غریب تھے۔

اس علاقے میں صرف دو قسم کے آدمی بستے تھے۔ شرابی اور کھلاڑی شرابی اپنی نکبت وفلاکت کو شراب کے جام میں ڈبو دیتے اور کھلاڑی اسے ورزش میں نگلتے تھے۔ وہ براتے انقلابیوں کی اولاد میں

سے تھے اور بڑی اچھی طرح اپنی سیاست کو سمجھتے تھے۔ انہیں معلوم تھا
کہ وارسیلز کی فوجوں نے جس وقت شہر پر قبضہ کیا تو ان کے باپوں کو،
ان کے بھائیوں کو اور اُن کے دوستوں کو، کس کس نے گولی کا نشانہ بنایا
تھا۔ وہ ہر ایسے شخص کو پکڑ کر قتل کر ڈالتے تھے۔ جس کے ہاتھ سخت
ہوتے جس کے سر پر ٹوپی ہوتی، یا جو ایسا کوئی نشان لگائے ہوتا
جس سے وہ مزدور طبقے کا آدمی معلوم ہوتا۔ اس غربت میں
اور سڑک کے پار اسی محلے میں بوچڑ خانے اور شراب کی دوکان کے
قریب میں بیٹھ کر میں نے اپنی تصانیف کی ابتدا کی۔ پیرس کا کوئی
اور حصہ مجھے اتنا پسند نہیں تھا جتنا کہ یہ حصہ، جس میں گرے ہوئے
درخت پڑے تھے، پرانے سفید پلستر والے مکان تھے جن کا رنگ
اب بادامی ہو گیا تھا۔ لمبی سبز رنگ کی بسیں تھیں جو چوک میں کھڑی
رہتیں، پیدل راستے پر ارغوانی رنگ کا پانی بکھرا رہتا اور پھر کارڈینل
لمائین کی گھاٹی جو دریا تک جاتی تھی۔ اور دوسری طرف موفے ٹرڈ
کا تنگ اور بھیڑ بھاڑ والا بازار۔ ایک راستہ پینتھین کو جاتا تھا اور دوسرا
وہ تھا جس کی سطح ہموار تھی۔ جب میں سائیکل پر کہیں جاتا تو ہمیشہ اسی راستے
سے جاتا تھا جس کی ہموار سطح پر سائیکل کے پہیئے بڑے مزے سے گھومتے۔
اسی سڑک پر وہ اونچا ہوٹل تھا جہاں پال ورلین مرا تھا۔ رہائش کے لئے
ہمارے پاس صرف دو ہی کمرے تھے ایک کمرہ میں نے ہوٹل کی سب سے اوپر
کی منزل میں ساٹھ فرانک ماہوار پر لے رکھا تھا۔ اور یہیں بیٹھ کر میں لکھا
کرتا تھا۔ یہاں سے لوگوں کے چھت اور چمنیاں اور پیرس کی ساری پہاڑیاں
نظر پڑتی تھیں۔

رہائشی مکان پر سے صرف لکڑی اور کوئلے والے کی دوکان نظر آتی تھی۔ وہ شراب بھی بیچتا تھا۔ گھٹیا قسم کی شراب بوچڑ خانے کے باہر گھوڑے کا سنہری سر بھی نظر آتا تھا، اُس جگہ جہاں کھلی کھڑکی کے سامنے جانوروں کے پیلے اور سُرخ ڈھیر ٹنگے رہتے تھے، اور بیئر رنگ والی شراب کی دوکان جہاں سے بڑھیا قسم کی شراب سستے داموں پر ملتی تھی۔ اور ان کے علاوہ ہمسایوں کی پلستر شدہ دیواریں اور کھڑکیاں نظر آتی تھیں۔ وہ ہمسائے جو رات کے وقت کسی شرابی کو گلی میں مدہوش اور کراہتا ہوا سنتے تو کھڑکیاں کھول کر کچھ اس قسم کی گفتگو کرتے۔

”پولیس کا سپاہی کہاں ہے؟ — جب ضرورت نہیں ہوتی تو بدمعاش یہیں موجود ہوتا ہے۔ وہ کسی نددبان کے پاس سویا پڑا ہوگا۔“ کوئی شخص پانی سے بھری ہوئی بالٹی کھڑکی سے انڈیل دیتا ہے۔ اور کراہنے کی آواز بند ہو جاتی ہے۔

”یہ کیا؟ پانی۔ اس نے عقلمندی کی ہے“ اور کھڑکیاں بند ہو جائیں آٹھ گھنٹے کام کرنے کے متعلق ماری کہتی ”اگر خاوند کو چھ بجے تک کام کرنا پڑتا ہے تو وہ گھر آتے ہوئے تھوڑی سی پی کر آتا ہے اور زیادہ فضول خرچی نہیں کرتا۔ اگر وہ صرف پانچ بجے تک کام کرتا ہے تو روزانہ پی کر آتا ہے یہاں تک کہ ایک پیسہ بھی نہیں بچتا۔ کام کا وقت کم کرنے سے مزدور کی بیوی کو نقصان پہنچتا ہے۔“

”تھوڑی سی یخنی اور پیو گے؟“ عورت نے اُس سے پوچھا۔

”نہیں، بہت بہت شکریہ۔ یخنی بڑی مزے دار ہے“

”تھوڑی سی اور پی کر دیکھو“

"وسکی سوڈا پلا دو۔"

"یہ تمہارے لئے مضر ہے۔"

"ہاں، میرے لئے مضر ہے۔ یہ الفاظ اور ان کی موسیقی کول پورٹر کی ہے یہ عقلمندی حس کے اظہار کے لئے تم پاگل ہوئی جارہی ہو۔"

"تم جانتے ہو میں تمہارے پینے سے خوش ہوا کرتی ہوں۔"

"ہاں، ہاں۔ صرف اتنی بات ہے کہ یہ میرے لئے مضر ہے۔"

جب یہ اُٹھے گی تو میں سیر ہو کر پی لوں گا۔ صرف سیر ہو کر ہی نہیں۔ بلکہ جتنی بھی ہے سب پی جاؤں گا۔ ہاں میں تھک گیا ہوں۔ بے حد تکان ہے۔

تھوڑی دیر کے لئے وہ سونا چاہتا تھا۔ وہ چپ چاپ لیٹ گیا۔ اور موت وہاں موجود نہ تھی۔ موت شاید دوسرے راستے پر چلی گئی ہے وہ سائیکلوں پر چلتی ہے اور بڑی خاموشی سے سڑک کی پٹڑی پر گھومتی رہتی ہے۔

نہیں میں نے پیرس کے متعلق بھی کچھ نہیں لکھا، وہ پیرس جو مجھے پسند تھا لیکن اس کے علاوہ بھی تو بہت کچھ نہیں لکھا۔

مثلاً وہ مویشی خانہ اور وہ پہلی اور بھوری ساج کی جھاڑیاں، دراعتی نالاںوں کا چمکتا ہوا شفاف پانی، الفلفا کے گھنے سبزہ زار، پگڈنڈی پہاڑیوں کے اوپر تک جاتی تھی۔ اور مویشی گرمیوں کے دنوں میں یوں بدکتے تھے جیسے ہرن۔ ان کا پگڈنڈی پر ایک لمبی قطار میں بھائیں بھائیں کرتے ہوئے اور گرد اڑاتے ہوئے چلنا۔ اور پہاڑیوں کے پیچھے شام کے دھندلکے میں بلند چوٹی کا صاف نظر آنا۔ جب ہم گھوڑے پر سوار وادی میں داخل

ہوتے تو چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ اندھیرے میں گھوڑے کی دُم تھامے ہوئے چلنا مجھے آج بھی یاد ہے۔ اُس رات جنگل کی تاریکی میں کچھ بھی نظر نہ آتا تھا۔ کتنی ہی کہانیاں لکھنے کے قابل تھیں لیکن میں نے ایک بھی نہیں لکھی۔

ہاں، اُس نیم پاگل لڑکے کے متعلق جسے مویشیوں کے باڑے میں چھوڑ کر ہم چلے گئے تھے اور اُسے ہدایت کر گئے تھے کہ کسی کو چارہ نہ دینا۔ تو کس سے ایک بوڑھا ادھر آ نکلا جس نے کسی وقت لڑکے سے کام کرا کے اُسے پیٹا تھا۔ بوڑھے نے کچھ چارہ مانگا اور لڑکے کے انکار کرنے پر کہنے لگا کہ وہ اُسے پھر پیٹے گا۔ جب بوڑھا باڑے میں داخل ہونے لگا تو لڑکا باورچی خانے سے بندوق اٹھا لایا اور اُسے وہیں ڈھیر کر دیا۔ ہم واپس آئے تو بوڑھے کو مرے ہفتے سے زیادہ عرصہ گذر چکا تھا۔ اس کی لاش سردی میں اکڑی پڑی تھی اور جسم کے بعض حصوں کو کتے کھا گئے تھے۔ بہر حال جو کچھ باقی بچا تھا۔ ہم نے کمبل میں لپیٹ کر برف گاڑی پر لاد لیا۔ لڑکے کو بھی ساتھ لیا اور ہم دونوں برف پر سے پھسلتے اور گھسٹتے ہوئے ساٹھ میل کا فاصلہ طے کر کے شہر پہنچے۔ لڑکے کو معلوم نہ تھا کہ اسے گرفتاری کے لئے لے جا رہے ہیں۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس نے اپنا فرض ادا کرنے میں بڑی مستعدی دکھائی ہے، اس لئے اسے شہر جا کر انعام ملے گا۔ وہ لاش کو شہر لے چلنے میں بڑی مشقت اٹھا رہا تھا تاکہ سب کو علم ہو جائے کہ بوڑھا کتنا خراب آدمی تھا کیونکہ وہ ایسی چیز چرانا چاہتا تھا جو اس کی ملکیت نہ تھی جب حاکمِ شہر نے اسے ہتھکڑی پہنا دی تو اُسے اپنی گرفتاری کا یقین ہی نہ آتا تھا۔ پھر وہ رونے لگا۔ اس کہانی کو بھی لکھنے کا خیال تھا۔ اور اس

علاقے کے متعلق قریباً بیس کہانیاں لکھی جا سکتی تھیں لیکن میں نے ایک بھی نہ لکھی معلوم نہیں کیوں؟

"تم انہیں بتاؤ، کیوں نہیں لکھیں؟"

"کیا نہیں لکھیں؟" عورت نے پوچھا

"کچھ نہیں۔"

جب سے وہ اس سے ملی تھی اُس نے شراب پینا کم کر دی تھی۔ لیکن اگر وہ اس مرض سے بچ بھی گیا تو وہ اِس عورت کے متعلق کچھ نہ لکھے گا اور نہ اُن دوسری عورتوں کے متعلق جن کے ساتھ اسے سابقہ پڑا تھا۔ امیر لوگ بڑے غبی ہوتے ہیں۔ شراب پینا اور چوسر کھیلنا، بس دو ہی باتیں انہیں آتی ہیں۔ وہ غبی بھی ہوتے ہیں اور ایک ہی بات کو بار بار دہراتے رہتے ہیں۔ اُسے بیچارے جولین کی وہ بات اب تک یاد تھی۔ کہ کس طرح اس پر امیروں کا رومانی رعب طاری تھا۔ ایک دفعہ وہ امیروں کے متعلق ایک کہانی لکھنے لگا جو اس طرح شروع ہوتی تھی "امیر لوگ مجھ سے اور آپ سے بالکل مختلف ہوتے ہیں" ایک شخص بول پڑا۔ ٹھیک ہے جولین اِن کے پاس بہت سامال ہوتا ہے۔" لیکن جولین اس لطیفے سے محظوظ نہ ہوا۔ وہ سمجھتا تھا کہ یہ لوگ کسی خاص شاندار نسل سے ہیں جب اسے معلوم ہُوا کہ وہ کسی دوسری نسل سے نہیں ہیں تو بیچارہ اُداس سا ہو گیا۔ اُسی طرح جس طرح کہ دوسری باتوں سے اُداس ہو جایا کرتا تھا

جو لوگ اُسے اپنے خوابوں سے بیدار کر دیا کرتے تھے انہیں وہ بڑی حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ ہم یہ بات جانتے تھے۔ وہ سمجھتا تھا کہ وہ ہر بات میں دوسروں کو مات دے سکتا ہے کیونکہ جس بات

کی اسے پروا نہ ہوتی اس سے اُسے کوئی اذیت نہ ہوتی تھی۔

ٹھیک ہے اب میں موت کی پروا نہ کروں گا۔ میں درد سے ہمیشہ خوف کھاتا رہا ہوں۔ لیکن میں دوسروں کی طرح برداشت بھی کرسکتا ہوں۔ ہاں اگر اسے آرام ہی نہ آئے یا نہ بے حال ہی کر دے تو دوسری بات ہے۔ شروع شروع میں مجھے بڑا خوفناک درد ہوا تھا اور جب میں نے سمجھا کہ اب برداشت سے باہر ہوگیا ہے تو وہ بند ہوگیا۔

بمبار دستے کا افسر ولیم سن ایک رات تاروں کے احاطے سے اندر رہا تھا کہ کسی جرمن نے بم پھینک کو اسے زخمی کردیا۔ اُس کا چیخنا اور رو رو کر ہر ایک کی منتیں کرنا مجھے آج تک یاد ہے، وہ کہتا تھا کہ خدا کے لئے مجھے گولی مار دو۔ وہ بڑا موٹا آدمی تھا، بڑا دلیر اور قابل افسر لیکن دکھاوے کا بڑا عادی تھا۔ اُس رات وہ بے چارہ تاروں کے جال میں پھنس گیا۔ اس کا پیٹ پھٹ گیا تھا اور انتڑیاں تاروں میں ایسی اُلجھی ہوئی تھیں کہ اسے تاروں سے چھڑانے کے لئے انتڑیاں کاٹ کر لانا پڑا۔ وہ پھر بھی زندہ تھا۔ مجھے گولی مار دو ہیری، میرے واسطے مجھے گولی مار دو۔ ایک دفعہ ہم لوگوں کی آپس میں بحث ہوگئی تھی کہ خدا اتنی تکلیف کبھی نہیں دیتا کہ وہ برداشت نہ ہوسکے۔ ایک شخص کا عقیدہ تھا کہ جب درد انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ تو خود بخود رفع ہو جاتا ہے۔ لیکن ولیم سن کی اُس رات کی تکلیف مجھے کبھی نہیں بھولی۔ میں نے مارفائن کی ساری گولیاں اُسے کھلا ڈالیں، جو میں اس لئے اپنے پاس رکھتا تھا کہ معلوم نہیں مجھے کب ان کی ضرورت پڑ جائے۔ لیکن اتنی ساری گولیوں کا بھی کوئی فوری اثر نہ ہوا۔

لیکن میری اس وقت کی تکلیف تو بڑی معمولی ہے اور اگر اس میں

کوئی اور اضافہ نہ ہوا تو فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ اِس وقت کوئی اچھا ساتھی ہوتا تو خوب ہوتا۔

اِس وقت کونسا ساتھی ہونا چاہئے تھا۔

لیکن ایسے حالات ہیں کہ جو کچھ میں کرتا ہوں، بہت دیر تک کرتا رہتا ہوں اور دیر سے کرتا ہوں، میرے ساتھی تو میرا انتظار نہیں کر سکتے۔ مہمان سب رخصت ہو چکے ہیں اور میں اپنی میزبان کے پاس اکیلا رہ گیا ہوں۔

میں موت سے بھی اتنا ہی اُکتا گیا ہوں جتنا دوسری سب چیزوں سے

"یہ تو بڑی اُکتا دینے والی بات ہے" اُس نے اونچی آواز سے کہا۔

"کون سی بات پیارے؟"

"کوئی سی ہو شیطان کی آنت کی طرح لمبی ہی ہوتی چلی جائے۔"

اُس نے عورت کے چہرے کی طرف دیکھا جس سے پرے آگ جل رہی تھی۔ وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے ہوئے تھی اور آگ کی روشنی اس کے چہرے کے خوبصورت خدوخال کو نمایاں کر رہی تھی۔ اُس کی آنکھیں نیند کے غلبے سے مندی جا رہی تھی۔ اِتنے میں دور سے چرخ کے چیخنے کی آواز آئی۔

"میں لکھتے لکھتے تھک گیا ہوں۔"

"سونے کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟"

"ہاں ہاں، تم جا کر سو کیوں نہیں رہتیں؟"

"میں تمہارے پاس بیٹھنا چاہتی ہوں"

"کوئی عجیب سا احساس تمہیں نہیں ہو رہا ہے؟"

"نہیں تو۔ بس ذرا نیند آ رہی ہے"

"مجھے ہو رہا ہے۔"

اُسے پھر موت کی موجودگی کا احساس ہو رہا تھا۔

"صرف ایک چیز ایسی ہے جسے میں نے کبھی ضائع نہیں کیا اور وہ میرا ذوقِ تجسس ہے۔"

"تم نے کبھی کوئی چیز ضائع نہیں ہونے دی۔ میں نے جتنے آدمیوں کو بھی دیکھا ہے تم اُن میں مکمل ترین انسان ہو۔"

"خدایا، عورت کا علم کِتنا محدود ہوتا ہے۔ تمہیں یہ خیال کیسے پیدا ہوا الہام ہوا ہے؟"

عین اُس وقت موت نے آکر اپنا سر چارپائی کی پائنتی پر رکھ دیا۔ وہ اُس کے سانس کی بُو تک محسوس کر رہا تھا۔

"موت کے متعلق درانتی اور کھوپڑی والا عقیدہ محض فضول ہے۔ موت اس طرح بھی ہو سکتی ہے جیسے دو سائیکل سوار سپاہی ہوں یا کوئی پرندہ ہو۔ یا جیسے ایک چوڑی سی تھوتھنی والا چرخ ہو۔"

موت اب آگے کی طرف سرکنے لگی اب اس کی کوئی خاص شکل وصورت نہ تھی۔ بس اتنا ہی تھا کہ خلاء میں اس نے کچھ جگہ گھیری ہوئی تھی۔ اس کا ایک وجود تھا۔

"اسے کہو چلی جائے۔"

لیکن جانے کے بجائے وہ اور نزدیک سرک آئی۔

"تمہارا سانس جہنم کی طرح نفرت انگیز ہے۔ مُردار کتیا۔"

وہ اور زیادہ نزدیک آگئی۔ اب وہ اُس سے بات بھی نہ کر سکتا تھا۔ اور جب موت نے دیکھا کہ وہ بولنے سے بھی عاجز آگیا ہے تو وہ

اور زیادہ نزدیک آگئی۔ اب وہ بغیر بولے اُسے ہٹانے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن وہ اور آگے بڑھی اور اپنا سارا بوجھ اس کی چھاتی پر ڈال دیا۔ اور اُس وقت جب موت اُس کی چھاتی پر سوار تھی اور وہ بول بھی نہ سکتا تھا۔ اُس نے عورت کو یہ کہتے سُنا

"بوانا سو گیا ہے۔ بڑے آرام سے چارپائی اُٹھاؤ اور خیمے میں لے چلو؟"

اب اُس میں اتنی سکت بھی نہ تھی کہ عورت سے موت کو ہٹانے کے لئے کہے۔ وہ چھاتی پر دبکی بیٹھی تھی اور بوجھ سے اس کا دَم گھٹا جا رہا تھا۔ اور پھر جب انہوں نے چارپائی اٹھائی تو یکایک سکون طاری ہو گیا اور چھاتی سے بوجھ اُتر گیا۔

اب صبح تھی، بلکہ صبح ہوئے کچھ دیر ہو چکی تھی کہ اُسے ہوائی جہاز کی آواز سنائی دی۔ دُور ایک ننھا سا نقطہ نظر آ رہا تھا۔ پھر اس نے ایک چکر لگایا جبتی لونڈے الاؤ جلانے کے لئے دوڑے۔ انہوں نے لکڑیوں پر مٹی کا تیل ڈالا اور گھاس میں دونوں سروں پر آگ لگا دی۔ دھواں دونوں سروں پر ستونوں کی طرح بلند ہوا اور ہوا اسے اُڑا اُڑا کر کیمپ کی طرف لانے لگی۔ ہوائی جہاز نے بلندی سے اُتر کر دو اور چکر لگائے۔ پھر زمین کی طرف جُھکا، سیدھا ہوا اور آرام سے زمین پر اُتر آیا۔ اس میں سے بوڑھا کامپٹن نکلا جو ڈھیلی سی پتلون، جیکٹ اور بادامی رنگ کی بانات کی ٹوپی پہنے اُس کی طرف بڑھا چلا آ رہا تھا۔

"کیا بات ہے۔ دوست؟" کامپٹن نے پوچھا۔

"ٹانگ میں تکلیف ہے" اُس نے جواب دیا۔ "ناشتہ کرو گے؟"

"نہیں شکریہ۔ میں صرف چائے پیوں گا۔ میں پس ماتھ پر آیا ہوں۔

اس لئے میم صاحب کو ساتھ نہ لے جا سکوں گا۔ اس میں صرف ایک سواری کی جگہ ہے۔ تمہاری لاری پیچھے پیچھے آ رہی ہے۔"

ہیلن، کامیٹن کو ایک طرف لے جا کر کچھ کہہ رہی تھی۔ کامیٹن پہلے سے بھی خوش خوش اُس کی طرف واپس آ گیا۔

"میں پہلے تمہیں پہنچا آؤں۔ میم صاحب کو میں پھر آ کر لے جاؤں گا۔ مجھے ڈر ہے کہ ہمیں تیل بھرنے کے لئے عروشہ میں بھی اُترنا پڑے گا۔ بہتر یہی ہے کہ ہم فوراً چل پڑیں۔"

"لیکن چائے تو تم نے پی ہی نہیں؟"

"تم جانتے ہی ہو۔ میں اس کا زیادہ عادی بھی نہیں۔"

لڑکوں نے چارپائی اٹھالی اور پہاڑی کے ساتھ ساتھ، سبز خیموں سے گذر کر میدان کی طرف لے چلے جہاں آگ اب خوب روشن ہو چکی تھی گھاس جل کر ختم ہو گئی تھی اور آگ کے شعلے ہوا سے ہوائی جہاز کی سمت جھکے چلتے تھے۔ اُسے ہوائی جہاز کے اندر لے جانے میں بڑی دقت ہوئی لیکن جب وہ اندر داخل ہو گیا تو بڑے سکون سے چمڑے کی نشست پر ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کی ٹانگ اس طرف سیدھی پھیلا دی گئی جہاں کامیٹن کے بیٹھنے کی جگہ تھی۔ کامیٹن نے انجن کو چالو کیا اور اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ اُس نے ہیلن اور حبشیوں کو ہاتھ ہلا ہلا کر الوداع کہا۔ جب انجن کی ٹھکا ٹھک کی آواز تیز ہو کر گونج میں تبدیل ہوئی تو جہاز حرکت میں آیا، مُڑا اور جانوروں کے بلوں اور بھٹوں پر سے اُچھلتا ہوا آگ کے ساتھ ساتھ بڑھا۔ پھر ایک آخری ہچکولے کے ساتھ ہوا میں بلند ہوا۔ اس نے دیکھا کہ ہیلن اور حبشی ہاتھ ہلا ہلا کر اسے رخصت کر رہے ہیں۔ خیمے اور ٹیلے آہستہ آہستہ چپٹے

ہونے لگے۔ میدان پھیلنے لگا۔ پھر درختوں کے جھنڈ اور جھاڑیاں سکڑنے لگیں۔ جانوروں کے چلنے والی پگڈنڈیاں دُور دُور تک نظر آنے لگیں اور چشمے۔ ایک چشمہ تو بالکل نیا تھا جو اس نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ زیبروں کی گول گول پیٹھیں اور بڑے بڑے سروں والے جنگلی حیوان، جب وہ وسیع میدان کی پگڈنڈیوں میں چلتے تو ایسے معلوم ہوتا جیسے کسی بہت بڑی ہتھیلی کی انگلیوں میں حرکت کر رہے ہیں۔ جب جہاز نزدیک پہنچتا تو وہ ڈر کر بھاگ اٹھتے اور ہر طرف منتشر ہو جاتے۔ اور بھورا اور پیلا میدان ہر طرف پھیلتا ہوا نظر آتا۔ اور جب وہ سامنے نظر اٹھاتا تو کامپٹن کی پیٹھ نظر آتی، ہٹی کا کوٹ پہنے ہوئے اور بھورے رنگ کی بانات کی ٹوپی۔ جب وہ پہاڑیوں کے نزدیک پہنچے تو جنگلی جانوران پر چڑھتے ہوئے دکھائی دیئے اور پھر جب جہاز پہاڑیوں کے اوپر پہنچ گیا تو سر سبز جنگل اور بانسوں کے گھنے جھنڈ گھاٹیوں پر پھیلے نظر آئے اور پھر ایک دفعہ جنگل، چوٹیوں اور ٹیلوں اور دروں میں بکھرا ہوا۔ پھر پہاڑیوں کی گھاٹیاں اور ایک اور وسیع میدان ارغوانی اور تند اور گرم۔ کامپٹن نے پیچھے مڑ کر دیکھا کہ وہ کیسے بیٹھا ہے۔ پھر اور کالے کالے پہاڑ سامنے کے رُخ نظر آنے لگے۔

اور پھر بجائے عروشہ کی طرف جانے کے جہاز بائیں طرف مڑا۔ اُسے خیال ہوا کہ شاید ہمارے پاس پٹرول کافی ہے۔ نیچے ایک ہلکے گلابی رنگ کا بادل، برفانی طوفان کی شکل کا، زمین اور ہوا میں پھیلا ہوا نظر آتا تھا معلوم نہیں یہ یکایک کہاں سے آگیا۔ وہ سمجھ گیا کہ ٹڈی دل جنوب کی طرف سے آرہا ہے۔ ہوائی جہاز اور بلندی پر چڑھنے لگا۔ اور اس کا رُخ مشرق کی جانب ہوگیا۔ پھر چاروں طرف تاریکی چھا گئی۔ مینہ اتنے زور سے برس رہا تھا کہ

جہاز آبشار کے نیچے کھڑا محسوس ہوتا تھا۔ آخر وہ اس طوفان سے نکل گئے کاہپٹن نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور مسکرا کر اشارہ کیا۔ جب اُس نے اُس طرف دیکھا تو ہر طرف سفیدی ہی سفیدی نظر آئی۔ ناقابلِ یقین حد تک دھوپ میں چمکتی ہوئی سفیدی اور ایسے جیسے ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہو۔ یہ کلیمن جارو کی چوکور چوٹی تھی۔ اور اب اسے معلوم ہوا کہ وہ اُسی طرف جا رہے تھے۔

عین اُس وقت رات کے اندھیرے میں چرخ نے کہیں سے چیخنا شروع کر دیا۔ اس کی آواز ایسے تھی جیسے کوئی انسان رو رہا ہو۔ وہ نیند سے بیدار نہ ہوئی۔ وہ خواب میں دیکھ رہی تھی کہ وہ لانگ آئی لینڈ میں ہے۔ اور اس کی بیٹی کے سوسائٹی میں متعارف ہونے کی تقریب ہو رہی ہے معلوم نہیں کیسے لیکن لڑکی کا باپ بھی تقریب میں شامل ہے۔ اور اُس کے ساتھ بڑی سختی سے پیش آیا ہے۔ پھر چرخ کی آواز نے اسے نیند سے بیدار کر دیا کچھ دیر کے لئے اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کہاں ہے۔ وہ بہت ڈری۔ پھر اُس نے برقی لیمپ اٹھایا اور اُس کی روشنی دوسری چارپائی پر ڈالی جس پر ہیری سو رہا تھا وہ مسہری میں سویا پڑا تھا، لیکن معلوم نہیں کیسے اس کی ٹانگ باہر نکل آئی تھی اور نیچے لٹک رہی تھی۔ زخم کی پٹیاں ڈھلک کر نیچے آ گئی تھیں اور اس کی طرف دیکھا نہ جاتا تھا۔

"مولو، اُس نے حبشی ملازم کو آواز دی "مولو، مولو۔"

پھر ہیری۔ ہیری۔" پھر اس کی آواز بلند ہو گئی: "ہیری خدا کے لئے آواز دو۔ ہیری۔"

لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ اس کے سانس کی آواز بھی نہ آتی تھی۔

باہر چرخ پھر اسی بھیانک آواز میں چیخا۔ جس سے وہ جاگ اُٹھی تھی۔ لیکن اس کا دل اس زور سے دھڑک رہا تھا کہ اس نے چرخ کی آواز نہ سنی۔

شیر کا شکار

دوپہر کے کھانے کا وقت ہو چکا تھا، اور وہ سب کے سب دوہری چھت کے سبز خیمے میں یوں بیٹھے تھے، جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

"تم لائیم جوس پیو گے یا لیمن سکوئش؟" میکومبر نے پوچھا۔

"میں تو گملٹ کا ایک جام پیوں گا،" رابرٹ ولسن نے کہا۔

"میں بھی گملٹ ہی پیوں گی۔ مجھے اس کی ضرورت بھی ہے۔" میکومبر کی بیوی بولی۔

"تو میں بھی تمہارا ساتھ دوں گا" میکومبر نے کہا۔ "اس سے کہو تین گملٹ تیار کرے۔"

خانساماں نے گملٹ تیار کرنا شروع کر بھی دیا تھا۔ اور وہ خیموں پر سایہ کرنے والے گھنے درختوں سے بندھے ہوئے کپڑے کے تر بتر تھیلوں میں ہوا سے ٹھنڈی ہوتی ہوئی بوتلیں نکال چکا تھا۔

"انہیں کیا دینا چاہیئے؟" میکومبر نے پوچھا۔

"ایک پونڈ کافی ہے" ولسن نے کہا۔" زیادہ رقم دے کر ان کا مزاج نہ خراب کر دینا۔"

"ان کا جمعدار خود تقسیم کر دے گا؟"

"ہاں"

ابھی آدھا ہی گھنٹہ گزرا تھا کہ، باورچی، بیرا، جانوروں کی کھال اتارنے والا چھوکرا، اور قلی فرانسس میکومبر کو ہاتھوں اور کندھوں پہ اٹھا کر ایک فاتح کی طرح کیمپ کی حدود سے خیموں تک لا رہے تھے۔ بندوق بردار وں نے اس مظاہرے میں کوئی حصہ نہ لیا تھا۔ جب حبشیوں نے میکومبر کو خیمے کے دروازے پہ اتارا تو اس نے سب کے ساتھ ہاتھ ملایا۔ ان کی مبارکباد لی اور پھر خیمے کے اندر جا کر اپنی بیوی کے آنے تک چارپائی پر ہی بیٹھا رہا۔ بیوی نے اندر آ کر مسٹر میکومبر سے بات تک نہ کی۔ چنانچہ وہ کپڑے کی چلمچی میں ہاتھ منہ دھونے کے لیے خیمے سے باہر نکل آیا۔ اور کھانے کے خیمے میں کپڑے کی کرسی پر بیٹھ کر گھنے سائے اور ٹھنڈی ہوا کا لطف اٹھانے لگا۔

"تم نے شیر مار ہی لیا" رابرٹ ولسن نے کہا۔" اور پھر ایسا خوبصورت اور عظیم الشان شیر کو دیکھ کر دل خوش ہوتا ہے۔ مسز میکومبر نے تیکھی نظروں سے ولسن کی طرف دیکھا۔ وہ بے حد حسین تھی۔ بڑے عیش و عشرت میں پلی ہوئی اور سوسائٹی میں بڑی ہی مقبول تھی۔ ابھی پانچ ہی سال ہوئے تھے کہ اسے ایک حسن افزا اُبٹنے کے اشتہار کے ساتھ اپنی تصویر شائع کرانے کے لیے پانچ ہزار ڈالر معاوضہ ملا تھا۔ حالانکہ یہ اُبٹنا اس نے کبھی استعمال نہ کیا تھا۔ فرانسس میکومبر کے ساتھ اس کی شادی ہوئے گیارہ سال ہو چکے تھے۔

"کتنا عمدہ شیر ہے، ہے ناں؟" میکومبر نے کہا۔ اس کی بیوی نے اب اس کی طرف نظر اٹھائی۔ اس نے ان دونوں مردوں کو یوں نظر بھر کر دیکھا، جیسے اس سے پہلے انہیں کبھی نہ دیکھا ہو۔

ان میں ایک تو ولسن تھا۔ سفید فام شکاری۔ جسے واقعی اس نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اس کا قد درمیانہ تھا، اور ریت کے رنگ کے زرد سرخی مائل بال، چھوٹی چھوٹی مونچھیں۔ بے حد سرخ چہرہ اور بڑی ظالم نیلی آنکھیں جن کے کناروں پر ہلکی سی سفید جھریاں نظر آتی تھیں۔ جب وہ مسکراتا تو ان میں خوشگوار سی گہرائی پیدا ہو جاتی۔ وہ مسز میکومبر کی طرف دیکھ کر مسکرایا، لیکن اس نے اپنی نظریں اس کے چہرے سے ہٹا لیں، اور اس کے کندھوں کی طرف دیکھنے لگی۔ جن کی خوبصورت ڈھلان اس کے ڈھیلے ڈھالے لباس میں سے صاف نظر آ رہی تھی۔ بائیں طرف چھاتی پر جہاں جیب ہونی چاہیئے تھی چار بڑے بڑے کارتوس لٹک رہے تھے، اس کے بڑے بڑے بھورے ہاتھ، اس کی پرانی پتلون۔ اس کے بیحد گندے جوتے۔ یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد اس کی نظریں پھر اس کے چہرے کی طرف لوٹ آئیں۔ اس نے چہرے پر وہ جگہ بھی دیکھی، جہاں اس کا دھوپ سے جلا ہوا سرخ رنگ اس سفید لکیر سے جا ملا تھا، جو اس کی ٹوپی نے ایک حلقے کی صورت میں اس کی پیشانی پر کھینچ رکھی تھی۔ یہ ٹوپی خیمے کے ایک ستون میں کھونٹی کے ساتھ ٹنگی ہوئی تھی۔

"اس شیر کے نام پر" رابرٹ ولسن نے جام اُٹھاتے ہوئے کہا۔ وہ پھر اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ لیکن وہ جواباً نہ مسکرائی اور استعجاب کی نظروں سے اپنے خاوند کی طرف دیکھنے لگی۔

فرانسس بیکومبر کا قد بہت لمبا تھا۔ جسم خوب مضبوط۔ بشرطیکہ ہڈیوں کی لمبائی کا مضائقہ نہ سمجھا جائے۔ رنگ سنولایا ہُوا، سر کے بال ملاحوں کی طرح کٹے ہوئے کسی قدر پتلے ہونٹ۔ بہ حیثیت مجموعی وہ خوبصورت آدمی سمجھا جاتا تھا۔ اس نے بھی وِلسن کی طرح افریقی شکاریوں کا سا لباس پہنا ہُوا تھا، فرق صرف یہ تھا کہ اُس کا لباس نیا تھا۔ اس کی عمر پینتیس سال کی تھی۔ اپنی آسائش کا بڑا خیال رکھتا تھا۔ گھریلو کھیلوں میں خوب مشاق تھا۔ مچھلی کے شکار میں بڑا ہوشیار لیکن اس شکار میں اُس نے اپنے آپ کو دوسروں کے سامنے بڑا نامرد ثابت کیا تھا۔

"ہاں، اس شیر کے نام پر" اس نے بھی شراب کا گلاس اُٹھاتے ہوئے کہا "یہ جو کچھ تم نے میرے لیے کیا ہے، میں کس منہ سے تمہارا شکریہ ادا کروں!"

بیوی مارگریٹ نے خاوند کی طرف سے نظریں ہٹا کر پھر وِلسن کی طرف دیکھا۔

"شیر کا ذکر چھوڑ دو" اُس نے کہا۔

وِلسن نے مسکرائے بغیر اس کی طرف نظر کی، اور اس دفعہ وہ مسکرا دی۔

"آج کا دن بڑا عجیب گزرا ہے" وہ پھر بولی "کیا تمہیں دوپہر کے وقت خیمے کے اندر بھی ٹوپی نہ پہننا چاہیئے تھی؟ تمہیں نے مجھے بتایا تھا، یاد ہے؟"

"ہاں، پہنی جا سکتی ہے" وِلسن نے کہا۔

"مسٹر وِلسن، تمہیں معلوم ہے، تمہارا چہرہ بڑا سُرخ ہے" اُس نے کہا اور

پھر مسکرائی۔

"شراب کی وجہ سے" ولسن نے جواب دیا۔

"میرا خیال ہے یہ وجہ نہیں۔ فرانسس بھی کافی شراب پیتا ہے لیکن اس کا چہرہ کبھی سُرخ نہیں ہُوا"

"آج تو سُرخ ہے" میکومبر نے لطیفہ پیدا کرنے کے لیے کہا۔

"ہرگز نہیں" مارگریٹ بولی "آج میرا چہرہ سُرخ ہو رہا ہے، لیکن مسٹر ولسن کا چہرہ ہمیشہ سرخ رہتا ہے"

"ممکن ہے نسلی اثر ہو" ولسن نے کہا "آپ میرے حُسن کے موضوع کو ختم کیوں نہیں کرتیں؟"

"میں نے تو ابھی شروع ہی کیا ہے"

"آؤ، کوئی اور بات کریں" ولسن نے کہا۔

"اس وقت گفتگو کرنا بڑا مشکل ہو رہا ہے" مارگریٹ بولی۔

"بے وقوف نہ بنو، مارگریٹ" اس کے خاوند نے کہا۔

"مشکل کیا ہے" ولسن نے کہا "بڑا خوبصورت شیر شکار ہُوا ہے"

مارگریٹ نے دونوں کی طرف دیکھا، اور ان دونوں نے سمجھ لیا کہ وہ ابھی رو دے گی۔

ولسن پہلے ہی اس بات کو تاڑ گیا ہوا تھا ——— اور اُسے پہلے ہی ڈر تھا، لیکن میکومبر کو اس بات کی پروا نہ تھی۔

"کاش، یہ واقعہ نہ ہُوا ہوتا۔ آہ، کاش ایسا نہ ہُوا ہوتا" یہ کہتے ہوئے وہ اپنے خیمے کی طرف چلی گئی۔ اس کے رونے کی آواز تو نہ آئی، لیکن انہوں نے

دیکھا کہ اُس کے کندھے گلابی رنگ کی دھوپ چھاؤں کی قمیص کے تلے کانپ رہے ہیں۔

"عورتیں یوں ہی بگڑ جاتی ہیں" ولسن نے لمبے آدمی سے کہا۔ "کچھ مضائقہ نہیں" "اعصاب پر بوجھ پڑا ہے۔ اور دونوں باتوں کا ایک ہی مطلب ہے۔"

"نہیں، یہ بات نہیں" میکومبر نے کہا۔ "میرا خیال ہے اب مجھے ساری عمر یہ شرمندگی اٹھانا پڑے گی۔"

"عقل کی بات کرو۔ شیر کا ذکر ہی چھوڑ دو۔ ساری بات بھول جاؤ" ولسن نے کہا۔ "اس معاملے کی طرف اشارہ تک نہ کرو۔"

"یہی سہی" میکومبر نے کہا۔ "اگرچہ میں تمہارے احسان کو کبھی نہ بھلا سکوں گا۔"

"چھوڑو اس ذکر کو" ولسن نے کہا۔ "فضول بات ہے۔"

وہ سایہ دار ببول کے درختوں کے نیچے گاڑے ہوئے کیمپ میں بیٹھے رہے۔ ان کے پشت کی طرف چٹانیں تھیں اور سامنے سرسبز گھاس کا قطعہ جو چٹانوں سے پُر دریا تک پھیلتا چلا گیا تھا اور اس سے پرے جنگل۔ وہ خنک شربت کے گلاس پیتے ہوئے ایک دوسرے سے نظریں چرا رہے تھے جبشی چھوکرے دوپہر کا کھانا میز پر لگا رہے تھے۔ ولسن کو ان کے چہروں سے صاف نظر آرہا تھا کہ وہ سب اس واقعہ سے واقف ہو چکے ہیں۔ اور جب میکومبر کے بیرے نے میز پر رکابیاں رکھتے ہوئے اپنے آقا کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا تو اس نے سواہلی زبان میں کچھ کہہ کر اُسے ڈانٹ دیا۔ لڑکا منہ لٹکائے واپس چلا گیا۔

"تم نے اس سے کیا کہا؟" میکو مبر نے پوچھا۔
"کوئی خاص بات نہیں۔ میں نے صرف یہ کہا ہے کہ ہوش میں آؤ ورنہ پندرہ کی ندر دا ز ڈز پڑے گی۔"
"پندرہ کیا؟ کوڑے؟"
"کوڑے مارنا خلاف قانون ہے۔" ولسن نے جواب دیا۔ "ہاں ان پر جرمانہ کیا جا سکتا ہے۔"
"کیا انہیں اب بھی کوڑے مارے جاتے ہیں؟"
"ہاں، اگر یہ شکایت کر دیں تو کافی جھگڑا پیدا ہونے کا امکان ہوتا ہے لیکن وہ شکایت نہیں کرتے اور جرمانے کے بجائے کوڑے کھانا منظور کر لیتے ہیں۔"
"کتنی عجیب بات ہے" میکو مبر نے کہا۔
"اس میں عجیب بات تو کچھ بھی نہیں۔ آپ مار کھانا بہتر سمجھیں گے یا تنخواہ سے ہاتھ دھو بیٹھنا؟"
میکو مبر سے یہ بات کہہ کر وہ کچھ الجھن میں پڑ گیا۔ اور پھر قبل اس کے کہ میکو مبر کوئی جواب دیتا وہ پھر بولا "تم جانتے ہو ہم سب کسی نہ کسی صورت میں روز مار ہی کھاتے ہیں۔ اور اسی کو ترجیح دیتے ہیں۔"
"یہ تو پہلے سے بھی بد تر رہی، خدایا!" اس نے سوچا "میری مصلحت بینی اور موقع شناسی کو کیا ہوا؟"
"ہاں، ہم مار کھانے کو ہی ترجیح دیتے ہیں۔" میکو مبر نے کہا۔ اب بھی وہ ولسن سے نظریں چرا رہا تھا۔ "مجھے اس شیر والے معاملے میں بڑی شرمندگی ہے۔ اب یہ بات باہر نہ نکلنی چاہیئے۔ میرا مطلب ہے اب اور تو کوئی نہ

سُننے گا۔؟"

"تمہارا مطلب ہے کہ میں اس کا ذکر متھائیگا کلب میں تو نہیں کروں گا۔؟"
ولسن نے سرد مہری سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اُسے توقع نہ تھی
کہ میکو مبر ایسی بات بھی کہے گا۔ یہ کمبخت بے وقوف بھی ہے اور نامرد بھی۔
مجھے اس سے کچھ اُنس ہو چلا تھا لیکن امریکیوں کو سمجھنا بڑا مشکل ہے۔

"نہیں، میں اس کا ذکر نہ کروں گا"۔ ولسن نے کہا۔ "میں پیشہ ور شکاری
ہوں۔ ہم لوگ اپنی اسامیوں کے متعلق باتیں نہیں کیا کرتے۔ اس طرف سے
تم بالکل خاطر جمع رکھو۔ ہاں یہ یاد رکھو، ہم سے ایسی بات کہنا جو تم نے کہی
ہے، شائستگی سے دور تصور کی جاتی ہے"۔

اس نے سمجھ لیا تھا کہ ان حالات میں اس سے ناراض ہو جانا بڑا آسان
ہو گیا ہے۔ اُس نے سوچا کہ اب میں کھانا بھی تنہا کھاؤں گا، اور کھانے کے
دوران میں کوئی کتاب بھی پڑھتا رہوں گا۔ سب اکیلے اکیلے کھانا کھائیں
گے۔ اس شکار کے دوران میں میں ان سے رسمی طور پر ملتا رہوں گا۔
فرانسیسی اسے کیا کہتے ہیں؟ غیر معمولی لحاظ و ملاحظہ۔ ایسے تعلقات موجودہ
جذباتی تکرار سے بہتر رہیں گے۔ میں اس کی توہین کر کے تعلقات منقطع کر لوں
گا۔ پھر کھانا کھانے کے دوران میں آرام سے کتاب پڑھتا رہوں گا، اور
ان کی وسکی پیتا رہوں گا۔ شکار کے دوران میں شکاری اور اس کی اسامی
کے درمیان بدمزگی پیدا ہو جائے تو یہی محاورہ استعمال کیا جاتا ہے۔ جب
کوئی دوسرا سفید فام شکاری ملے اور آپ پوچھیں کہ "حالات کیسے ہیں؟"
اور وہ جواب دے گا "اوہ۔ میں ابھی تک اُن کی وسکی اڑا رہا ہوں"۔ اس
سے سمجھ لیا جاتا ہے کہ تعلقات بگڑ چکے ہیں۔

"میں معافی چاہتا ہوں" میکومبر نے یہ کہتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ ادھیڑ عمر میں بھی اس کے امریکی خدوخال نوجوانوں کے سے تھے۔ ولسن کی نگاہیں اس کے ملاحوں کی طرح کٹے ہوئے بالوں پہ، بڑی نزاکت سے جھپکتی ہوئی خوبصورت آنکھوں پہ، ستواں ناک پہ، باریک ہونٹوں پہ اور حسین گالوں پہ گڑ گئیں۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں نے اس بات کا خیال نہیں کیا۔ اور بھی کتنی ہی باتیں ہیں جن کا مجھے خیال نہیں رہتا"

اب میں کیا کر سکتا ہوں۔ ولسن نے دل میں سوچا، کتنی آسانی سے اور کس صفائی سے کشیدگی بڑھ رہی تھی۔ لیکن اس بھکاری نے توہین کے باوجود معافی مانگنا شروع کر دی ہے۔ اس نے ایک دفعہ اور کوشش کی "میرے متعلق تم فکر نہ کرو۔ کہ میں لوگوں سے کہتا پھروں گا۔ میں نے اپنی روزی کمانی ہے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ افریقہ میں کوئی عورت شیر مارے بغیر نہیں رہی اور نہ کوئی سفید فام مرد شیر سے ڈر کر کبھی بھاگا ہے"

"لیکن میں تو خرگوش کی طرح بھاگ اُٹھا" میکومبر نے کہا۔

ولسن حیران تھا کہ جو شخص اس قسم کی باتیں کرے اس سے کیا سلوک کیا جائے۔ اس نے اپنی نیلی، بے درد، توپچی کی سی آنکھوں سے میکومبر کی طرف دیکھا اور مسکرانے لگا۔ اس کی مسکراہٹ بڑی لطیف ہوا کرتی تھی بشرطیکہ آپ اس کی آنکھوں کی طرف نہ دیکھیں خصوصاً اس وقت جب اُسے کوئی دکھ پہنچایا گیا ہو۔

"شاید میں بھینسا ہی مار لوں" اُس نے کہا۔ "اب اگلا شکار اسی کا ہے نا؟"

"ہاں، اگر تم پسند کرو۔ تو کل صبح چلیں گے۔ ولسن نے اس سے کہا۔

شاید اس نے اس شخص کے متعلق رائے قائم کرنے میں جلد بازی سے کام لیا ہے۔ اب یہی سمجھنا چاہیئے۔ ان امریکنوں کے متعلق کوئی شخص یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ وہ پھر میکومبر کا مداح ہو گیا۔ ہاں اگر صبح کا واقعہ بھلا دیا جائے۔ لیکن یہ بھول بھی کیسے سکتا ہے۔ صبح کا واقعہ بڑا ہی ناخوشگوار تھا۔

"لو، وہ میم صاحب آ گئیں" اس نے کہا۔ وہ اپنے خیمے سے نکل کر آ رہی تھی اور بڑی تازہ دم، خوش خوش اور پیاری دکھائی دے رہی تھی۔ اس کا بیضوی چہرہ کتنا حسین تھا۔ اتنا حسین کہ اس پر بیوقوفی کا شک ہونے لگتا تھا۔ لیکن وہ بے وقوف نہ تھی۔ نہیں، ولسن نے سوچا۔ بیوقوف تو وہ بالکل نہیں ہے۔

"سرخ چہرے والے حسین مسٹر ولسن کیسے ہیں؟ اب طبیعت اچھی ہے فرانسس، میرے گوہر نایاب"؟

"ہاں بہت اچھی ہے" میکومبر نے جواب دیا۔

"میں نے سارے جھگڑے کے سر پر خاک ڈال دی ہے" اس نے میز کے نزدیک بیٹھتے ہوئے کہا "اس معاملے کی آخر اہمیت ہی کیا ہے۔ کہ فرانسس شیر مارنے میں ماہر ہے یا نہیں؟ یہ اس کا پیشہ تو نہیں ہے، اور مسٹر ولسن کا تو پیشہ ہی یہی ہے۔ مسٹر ولسن ہر چیز کے مارنے میں بڑے ماہر ہیں، تم ہر چیز مار لیتے ہو ناں۔

"کیوں؟ نہیں؟"

"ہاں، ہر چیز" ولسن نے کہا۔ "کوئی چیز بھی ہو" یہ عورتیں دنیا بھر میں سب سے زیادہ سنگدل ہیں۔ اس نے سوچا، بڑی سخت طبیعت، بڑی ظالم، بڑی شامت گر، اور بڑی حسین اور ان کے مرد اتنے نرم ہیں، یا پھر سخت

ہونے کے دوران میں ان کے اعصاب پس چکے ہیں۔ یا شاید یہ عورتیں ایسے مرد انتخاب کرتی ہیں جنہیں وہ اپنے تابع فرمان نہ کہہ سکیں۔ لیکن جس عمر میں شادی کرتی ہیں اس عمر میں اتنی عقل کہاں ہوتی ہے شکر ہے کہ مجھے امریکی عورتوں کے متعلق پہلے ہی تجربہ حاصل ہو چکا ہے۔ لیکن یہ بہت ہی حسین ہے۔

"ہم کل صبح بھینسوں کے شکار کے لیے جا رہے ہیں" اس نے بتایا۔

"میں بھی جاؤں گی"

"نہیں، تم نہیں جاؤ گی"

"ہاں، ہاں میں ضرور جاؤں گی کیوں فرانسس؟"

"تم کیمپ میں کیوں نہیں ٹھیرتیں؟"

"کسی قیمت پر بھی نہیں" وہ بولی "میں آج کی طرح کوئی اور موقع کسی قیمت پر بھی ضائع نہ ہونے دوں گی"

جب وہ اٹھ کر چلی گئی تو ولسن نے سوچا جب یہ روتی ہوئی اٹھی تھی، تو کتنی حسین دکھائی دیتی تھی۔ یوں نظر آتا تھا، جیسے میکومبر کا دکھ بھی اسی کو محسوس ہو رہا ہے اور اپنا بھی۔ وہ آج کی تلخ حقیقتوں پر غور کرنا چاہتی تھی۔ صرف بیس منٹ کے لیے غیر حاضر رہ کر، امریکی عورت کے ستمگرانہ غلاف میں لپٹی ہوئی اب پھر واپس آگئی ہے کتنی موذی ہیں یہ عورتیں ــــ بڑی ظالم اور ستمگر۔

"ہم کل تمہیں ایک نیا تماشا دکھائیں گے" فرانسس میکومبر نے کہا۔

"تم تو نہیں آرہیں، نا؟" ولسن نے کہا۔

"میں کیوں نہ آؤں گی" وہ بولی "میں تمہارا کارنامہ دیکھنے کے لیے بڑی

بے تاب ہوں۔ آج صبح تم نے بڑا دلفریب کام کیا۔ میرا مطلب ہے اگر، جانداروں کے پیچھے اُڑا دینے کو دلفریب کہا جاسکتا ہے۔"

"کھانا چنا جا چکا ہے۔" وِلسن نے بتایا اور پھر بولا۔ "آج تم بڑی خوش ہو"؟

"خوش کیوں نہ ہوں۔ میں یہاں افسردہ رہنے کے لیے تو نہیں آئی۔"

"خیر، افسردگی کا تو کبھی موقع نہیں آیا" وِلسن نے کہا۔ اسے دریا میں بڑی بڑی چٹانیں نظر آرہی تھیں اور اُن کے پرے اونچا کنارہ جس پر درخت اُگے ہوئے تھے اور صبح کے سارے واقعات اُس کے دماغ میں گھوم رہے تھے۔

"نہیں، بڑے مزے کا وقت گزرا" وہ بولی۔ "اور کل۔ تم اندازہ ہی نہیں کرسکتے کہ میں کس بے تابی کے ساتھ کل کا انتظار کر رہی ہوں"

"یہ ایلینڈ کا گوشت ہے۔ جو چھوکرا تمہیں پیش کر رہا ہے۔" وِلسن نے کہا۔

"ایلینڈ وہی ہوتا ہے ناں، گائے کی طرح بھدا، اور جو خرگوش کی طرح اُچھلتا ہے"

"ہاں بالکل اسی طرح"

"بڑا لذیذ گوشت ہے" میکومبر بولا۔

"فرانسس، یہ ایلینڈ تم نے مارا تھا؟"

"ہاں"

"یہ خطرناک جانور تو نہیں ہوتے؟"

"صرف اُس وقت جب وہ تمہارے اوپر آن گریں" وِلسن نے بتایا۔

"شکر ہے خدا کا۔"

"یہ حماقت تھوڑی دیر کے لیے موقوف کر دو تو کیا حرج ہے۔" میکومبر نے ایلینڈ کا گوشت کاٹتے ہوئے اور اُسے آلوؤں کے بھرتے، گوشت کے رس اور گاجر کے ساتھ ملا کر اُلٹا کئے ہوئے کانٹے پر چڑھاتے ہوئے کہا۔

"بہت بہتر، میں خاموش ہو جاتی ہوں۔ خاص طور پر اس لیے بھی، کہ تمہاری طرزِ گفتگو بڑی خوشگوار ہے۔"

"شام کے وقت ہم شیر کے شکار کی خوشی میں شمپین پئیں گے۔" ولسن بولا۔ "اس وقت تو خاصی گرمی ہے۔"

"اوہ، شیر کی خوشی میں،" مارگریٹ بولی "شیر کو تو میں بھول ہی گئی تھی۔"

معلوم ہوتا ہے یہ مجھے ضرور نوازے گی۔ رابرٹ ولسن نے سوچا۔ یا شاید اپنے خیال کے مطابق حالات کو خوشگوار بنانے کی کوشش کر رہی ہے جب کسی عورت کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس کا خاوند ذلیل اور ڈرپوک ہے تو اسے کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیئے؟ بڑی ہی ظالم ہے۔ لیکن یہ سب ظالم ہی تو ہوتی ہیں۔ اپنے خاوندوں پر حکومت کرتی ہیں اور حکومت کرنے کے لیے کسی وقت ظلم بھی کرنا پڑتا ہے۔ لیکن میں ان کے ظلم و ستم کا مطالعہ کافی کر چکا ہوں۔

"تھوڑا سا اور ایلینڈ کا گوشت لو۔" اس نے بڑی ملاطفت کے انداز میں کہا۔

تیسرے پہر کافی دیر سے، ولسن اور میکومبر، حبشی ڈرائیور اور دو بندوق بردار کو ساتھ لے کر موٹر میں بیٹھ کر نکلے۔ مسز میکومبر کیمپ ہی میں ٹھہری رہیں، اس نے کہا تھا کہ اس وقت بہت گرمی ہے۔ میں صبح تمہارے ساتھ چلوں گی۔

جب وہ جانے لگے، تو ولسن نے اُسے بڑے درخت کے نیچے کھڑے دیکھا۔ وہ اپنے ہلکے گلابی مائل خاکی لباس میں حسین تو نہیں، لیکن کافی بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے بال گوندھ کر گردن کے پاس باندھ رکھے تھے۔ اس کا چہرہ اتنا تر و تازہ تھا، جیسے وہ انگلستان میں ہو۔ موٹر کو گزرتے ہوئے دیکھ کر اس نے ہاتھ ہلایا، موٹر لمبی لمبی گھاس میں سے گزرتی، درختوں میں سے مڑتی، چھوٹے چھوٹے ٹیلوں اور جھاڑیوں میں گم ہو گئی۔

جھاڑیوں میں انہیں امپالا کا ایک گلہ نظر آیا۔ موٹر سے نکل کر انہوں نے ایک بوڑھا نر تاکا، جس کے سینگ پھیلے ہوئے تھے۔ میکومبر نے ایک ہی گولی سے اُسے دو سو گز کے فاصلے سے مار گرایا۔ باقی گلہ ایک دوسرے پر سے لمبی لمبی چھلانگیں مارتا ہوا اُٹھ بھاگا۔ وہ اپنی ٹانگیں لپیٹے ہوئے ہوا میں یوں تیرتے ہوئے نظر آتے تھے۔ جیسے کبھی کبھی خواب میں انسان اپنے آپ کو اُڑتے ہوئے پاتا ہے۔

"بڑا قابلِ تعریف نشانہ کیا ہے تم نے"، ولسن نے کہا، "حالاں کہ ان کا جسم چھوٹا ہے اور فاصلہ کافی تھا۔"

"کیا اس کا سر اچھا ہے؟" میکومبر نے پوچھا۔

"بہترین ہے"، ولسن نے جواب دیا۔ "اگر تم ایسے ہی نشانہ کرتے رہے تو آئندہ تمہیں کوئی دقت پیش نہ آئے گی۔"

"تمہارا کیا خیال ہے، ہمیں کل بھینسیں مل جائیں گی؟"

"امکان تو کافی ہے۔ وہ علی الصبح گھاس چرتی ہیں۔ اور اگر قسمت نے یاوری کی تو ہمیں کھلے میدان میں مل جائیں گی۔"

"میں چاہتا ہوں کہ شیر والی بدنامی کسی طرح مجھ سے ٹل جائے۔" میکومبر نے کہا۔

"اپنی بیوی کے سامنے اس قسم کی کمزوری دکھانا، کوئی خوشگوار بات نہیں ہے۔"

میرا خیال ہے کہ یہ تمہارے تصور سے بھی زیادہ ناخوشگوار بات ہے۔ ولسن نے دل میں کہا۔ بیوی ہو یا نہ ہو۔ اس قسم کی حرکت کر کے اس کا ذکر کرنا بھی الشان کو گوارا نہیں ہو سکتا۔ پھر وہ بولا "میرا خیال ہے کہ اس کا ذکر اب چھوڑ دیا جائے۔ شیر کے شکار میں پہلی دفعہ ہر شخص ہراساں ہو جاتا ہے اب یہ بات ختم ہو چکی ہے۔ اسے بھول جاؤ۔"

لیکن اس رات کھانا کھانے اور آگ کے پاس بیٹھ کر وسکی اور سوڈا پینے کے بعد فرانسس میکومبر جب مسہری لگا کر بستر پر لیٹا۔ اور رات کی آوازیں سننے لگا۔ تو اسے معلوم ہوا کہ شیر والی بات ابھی ختم نہیں ہوئی۔ یہ نہ ختم ہوئی تھی اور نہ شروع ہوئی تھی۔ بلکہ جس طرح واقع ہوئی تھی، اسی طرح دماغ میں نقش تھی، ہاں۔ اس کے بعض حصے اور زیادہ اُجاگر ہو گئے تھے۔ جنہیں یاد کر کے وہ شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ شرم سے بھی زیادہ اُسے اپنے خوف و ہراس کا احساس ستا رہا تھا۔ اُسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اپنے آپ پر اعتماد اور بھروسہ اُٹھ جانے سے ایک خلاء پیدا ہو گیا ہے اور اس خلاء میں خوف براجمان ہے۔

اس خوف کا احساس اس وقت شروع ہوا تھا جب گزشتہ رات شیر کے دھاڑنے کی آواز نے اُسے سوتے سے بیدار کر دیا تھا۔ شیر دریا سے اُوپر کی طرف کہیں بول رہا تھا۔ یہ بڑی بلند آواز تھی۔ اور پھر اس کے بعد کھانسنے کی سی آواز جو اس طرح معلوم ہوتی تھی، جیسے خیمے کے باہر سے آ رہی ہو۔ فرانسس میکومبر اسے سُن کر جاگ اُٹھا تھا، اور پھر اس پر خوف طاری ہو

گیا تھا۔اس کی بیوی بڑے سکون سے سو رہی تھی۔ اور اس کے سانس لینے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ اپنے ڈر کا اظہار کس سے کرتا؟ اس ڈر میں اس کا کوئی اور ساتھی بھی نہ تھا۔ اُسے وہ صومالی کہاوت بھی معلوم نہ تھی جس میں کہا گیا ہے کہ دلیر آدمی شیر سے تین دفعہ خوف کھاتا ہے۔ جب وہ پہلی دفعہ اس کے قدموں کے نشان دیکھتا ہے۔ جب وہ پہلی دفعہ اس کی گرج سنتا ہے۔ اور جب وہ پہلی دفعہ اس کا سامنا کرتا ہے۔ پھر جب وہ کھانے کے خیمے کے اندر لالٹین کی روشنی میں، سورج طلوع ہونے سے پہلے ناشتہ کر رہے تھے تو شیر پھر دھاڑا، اور فرانسس کو پھر بھی ایسے محسوس ہوا جیسے وہ کیمپ کے کنارے کھڑا بول رہا ہے۔

"آواز سے تو جوان معلوم ہوتا ہے۔" رابرٹ ولسن نے سوکھی مچھلی اور کافی کے پیالے پر سے نظریں اُٹھاتے ہوئے کہا۔ "ذرا اس کے کھانسنے پر غور کرو۔"

"کیا یہ بہت دُور سے بول رہا ہے؟"

"دریا کے اُوپر کی سمت کوئی میل بھر دُور ہوگا۔"

"کیا ہم اسے دیکھ سکیں گے؟"

"اُمید تو ہے۔"

"کیا اس کی آواز اتنی دُور پہنچ جاتی ہے؟ ایسے معلوم ہوتا ہے، جیسے کیمپ میں آن پہنچا ہے اور یہیں سے بول رہا ہے۔"

"کمبخت کی آواز بڑی دُور تک پہنچتی ہے۔" رابرٹ ولسن نے کہا۔ "یہ بلا شکار کے قابل معلوم ہوتا ہے۔ چھوکرے کہتے تھے کہ اس علاقے میں ایک بہت بڑا شیر موجود ہے۔"

"اگر مجھے موقع ملے تو کس جگہ گولی مارنی چاہیئے؟" میکومبر نے پوچھا "میرا مطلب ہے، اس کے "بکرو کتنے کے سلیے"

"کندھوں میں" ولسن نے جواب دیا "اور اگر تم مار سکو تو گردن میں، بہرحال ہڈی میں مارو، اور اسے توڑ کر رکھ دو"

"میرا خیال ہے کہ میں ٹھیک نشانہ مار لوں گا" میکومبر نے کہا۔

"تمہارا نشانہ بڑا اچھا ہے۔ بڑے اطمینان سے اچھی طرح شست لے کر مارنا۔ پہلے شیر کا مارنا بڑی بات ہوتی ہے"

"کتنی دور سے مارنا چاہیئے"؟

"اس کے متعلق میں کیا بتاؤں۔ شیر خود بتائے گا۔ لیکن اس وقت تک گولی نہ مارو جب تک وہ قریب نہ آجائے تاکہ نشانہ خطا جانے کا امکان نہ رہے"

"ایک سو گز سے نزدیک؟" میکومبر نے پھر پوچھا۔

ولسن نے جھٹکے کے ساتھ نظریں پھیر کر اس کی طرف دیکھا۔

"سو گز ٹھیک ہے۔ اس سے کم کا بھی امکان ہے۔ لیکن اس سے زیادہ فاصلے پر مارنے کی کوشش نہ کرنی چاہیئے۔ سو گز مناسب فاصلہ ہے۔ اس فاصلے سے تم جس جگہ چاہو، آسانی سے گولی مار سکتے ہو۔ لو، وہ میم صاحب آگئیں"

"صبح بخیر۔ کیا ہم اس شیر کا پیچھا کریں گے۔؟"

"بس ناشتہ ختم کرتے ہی چل پڑیں گے" ولسن نے جواب دیا "تمہاری طبیعت کیسی ہے؟"

"بہت اچھی ہے"

"میں ذرا جا کر دیکھ آؤں کہ سب سامان تیار ہو چکا ہے یا نہیں" یہ کہتے

ہوئے وِلسن باہر نکل گیا۔شیر کے دھاڑنے کی آواز ایک دفعہ پھر سُنائی دی۔
"شوریدہ سر بھکاری"، وِلسن بولا۔"اسے خاموش کرنا پڑے گا۔"
"کیوں کیا بات ہے فرانسس؟" اس کی بیوی نے کہا۔
"کچھ نہیں" میکومبر نے جواب دیا۔
"کوئی بات تو ضرور ہے، تم حواس باختہ سے کیوں ہو رہے ہو۔؟"
"نہیں تو۔"
"بتا بھی دو۔" اس نے خاوند کے چہرے پہ نظریں جماتے ہوئے کہا۔
"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟"
"شیر کی یہ وحشت ناک دھاڑیں" اُس نے کہا۔" یہ تمام رات یونہی گرجتا رہا ہے۔ تم نے نہیں سُنا؟"
"تم نے مجھے کیوں نہ جگایا، رات کے وقت یہ آوازیں سُن کر بڑا لطف آتا۔"
"میں نے اس کمبخت کو مارنا ہے۔" میکومبر نے بڑی غمزدہ آواز میں کہا۔
"ہاں، تو اسی لیے تو تم یہاں آئے ہو۔ کیوں نہیں؟"
"یہ تو ٹھیک ہے، لیکن مجھے ڈر محسوس ہو رہا ہے۔ اس کی گرج میرے اعصاب کو کمزور کئے دیتی ہے۔"
"تو پھر جیسے وِلسن نے کہا ہے، اسے مار دو اور اس کی گرج بند کر دو۔"
"ٹھیک ہے پیاری" فرانسس میکومبر نے کہا۔"کہنے کو تو یہ بڑی آسان بات معلوم ہوتی ہے، مگر"

"تم ڈر تو نہیں رہے ؟"

"نہیں ڈرتا تو نہیں لیکن ساری رات اس کی آوازیں سن سن کر میرے اعصاب خراب ہو گئے ہیں۔"

"تم بڑی آسانی سے آسے مار لو گے۔" بیوی نے کہا۔ "مجھے اس بات کا یقین ہے۔ اور میں بڑی بے تابی سے اس کا انتظار کر رہی ہوں۔"

"اچھا تم ناشتہ ختم کر لو ہم فوراً ہی چل پڑیں گے۔"

"ابھی تو دن کی روشنی بھی نہیں پھیلی۔" وہ بولی "یہ عجیب بے وقت موقع ہے۔"

عین اس وقت شیر ببر بڑی خوفناک آواز میں دھاڑا۔ پہلے اس کی آواز سینے کی گہرائیوں سے نکلی۔ پھر فوراً ہی حلق سے۔ بلند سے بلند تر ہوتی ہوئی لہریں جن سے ہوا بھی تھرتھرا رہی تھی۔ پھر ہلکی سی آہ۔ اور پھر سینے کی گہرائی سے نکلتی ہوئی غراہٹ۔

"ایسے معلوم ہوتا ہے۔ جیسے یہیں کہیں موجود ہے۔" میکومبر کی بیوی نے کہا۔

"خدا وندا" میکومبر چلایا۔ مجھے اس کی آواز سے نفرت ہے۔

"بڑی بارعب آواز ہے۔" بیوی نے کہا۔

"بارعب؟ یہ تو بڑی خوفناک ہے۔"

عین اس وقت رابرٹ ولسن اپنی چھوٹے قد کی بدنما اور بہت موٹی نالی کی بندوق لیے برآمد ہوا۔

"آؤ چلیں" اس نے کہا۔ "تمہارے بندوق بردار نے تمہاری سپرنگ فیلڈ اور دوسری بھاری بندوق لے لی ہے۔ سب چیزیں موٹر

میں پہنچ چکی ہیں تم نے ٹھوس گولیاں لے لی ہیں۔؟"

"ہاں"

"میں بھی تیار ہوں" مسز میکومبر نے کہا۔

"اس کا شور و غل بند کر دو" ولسن بولا "تم اگلی سیٹ پر بیٹھو میم صاحب میرے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ جائیں گی۔

وہ موٹر کار میں بیٹھ کر درختوں میں سے نکلتے ہوئے دریا کی اوپر کی سمت روانہ ہو گئے۔ میکومبر نے اپنی رائفل کھولی۔ دھات میں لپٹے ہوئے کارتوسوں کو دیکھا اور پھر اُسے بند کر کے حفاظتی کمانی چڑھا دی۔ اس نے محسوس کیا کہ اُس کے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ اس نے اپنی جیب کو ٹٹول کر تسلی کر لی کہ اور کارتوس بھی موجود ہیں۔ وہ پیچھے کی طرف مڑا، جہاں ولسن اُس کی بیوی کے پاس بغیر دروازے کی ڈبہ نما موٹر کار میں بیٹھا تھا۔ دونوں جوش اور مسرت سے ہنس رہے تھے۔ ولسن نے آگے کی طرف جھک کر سرگوشی میں کہا۔

"پرندوں کو جھپٹتے ہوئے دیکھ رہے ہو؟ یہ اس بات کی نشانی ہے کہ وہ اپنا شکار کھا کر فارغ ہو چکا ہے"

دُور دریا کے دوسرے کنارے پر میکومبر نے دیکھا کہ گدھ درختوں کے اُوپر منڈلا رہے ہیں۔ اور نیچے اُتر۔ تے آ رہے ہیں۔

"امکان یہ ہے کہ وہ آرام کرنے سے پہلے یہاں پانی پینے آئے گا۔ ذرا ہوشیاری سے دیکھتے رہنا"

وہ دریا کے بلند کنارے پر آہستہ آہستہ چلے جا رہے ہے۔ جو اس کے چٹانوں سے بھرے ہوئے پاٹ کے ساتھ دُور تک کٹا ہوا تھا۔ بڑے بڑے درختوں

کے گرد گھومتے ہوئے وہ بڑھتے چلے گئے۔ میکومبر سامنے والے کنارے کی طرف دیکھ رہا تھا کہ ولسن نے اس کا بازو تھام لیا۔ کار رک گئی۔

"وہ سامنے کھڑا ہے" اس نے سرگوشی میں کہا۔ "آگے دہنی طرف دیکھو۔ باہر نکلو اور مار لو۔ بڑا بے نظیر شیر ہے"

میکومبر نے بھی اب شیر کو دیکھ لیا۔ وہ قریب قریب لمبائی کے رُخ کھڑا تھا۔ اپنا عظیم الشان سر اُٹھائے وہ ا ... کی طرف مُڑا ہوا تھا۔ اس کی سیاہی مائل ایال صبح کی ہوا میں لہراتی دکھائی دے رہی تھی۔ شیر کنارِ دریا کی ایک چٹان پر کھڑا صبح کی ہلکی ہلکی روشنی میں کتنا شاندار نظر آ رہا تھا۔ اس کے کندھے بھاری تھے اور پیپے جیسا بدن بڑا ہموار اور پھیلا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

"کتنی دور ہو گا۔؟" میکومبر نے اپنی رائفل بلند کرتے ہوئے پوچھا۔

"قریباً پچھتر گز۔ باہر نکلو اور مار لو"

"یہیں سے کیوں نہ ماروں، جہاں میں بیٹھا ہوں"

"شیروں کو موٹر میں بیٹھ کر شکار نہیں کیا کرتے" اس نے ولسن کو اپنے کان میں کہتے ہوئے سنا۔ "نکل بھی جاؤ۔ وہ سارا دن تو ... کھڑا نہیں رہے گا"

میکومبر کھڑکی میں سے نکل کر پائیدان پر آیا اور پھر اس سے زمین پر قدم رکھا۔ شیر شاہانہ انداز میں بڑی بے پروائی سے اس چیز کی طرف دیکھ رہا تھا جو اُسے ایک بہت بڑے گینڈے کی طرح نظر آ رہی تھی۔ انسان کی بُو اس کی طرف نہ جا سکتی تھی۔ اس لیے وہ اپنا بڑا سر اِدھر اُدھر گھما گھما کر اس چیز کی طرف گھور رہا تھا۔

وہ اس سے ڈرا تو نہیں لیکن گھاٹ پہ اُتر کر پانی پینے سے پہلے وُہ کچھ متامل سا تھا۔ کہ یکایک اس نے ایک انسانی جسم کو اس میں سے الگ ہوتے ہوئے دیکھا اس نے اپنا بھاری بھرکم سر موڑا، اور درختوں کی اوٹ میں غائب ہونے کو ہی تھا کہ ایک دھماکے کی آواز آئی۔ اور سیسے کی گولی اس کے پہلو کو چیرتے اور جلاتے ہوئے اُس کے معدے میں جا گھسی۔ وُہ اپنے بھرے ہوئے پیٹ کا بوجھ سنبھالتے ہوئے بھاری قدموں کے ساتھ درختوں اور لمبے لمبے گھاس کی طرف لپکا۔ ایک اور دھماکہ ہوا، اور گولی ہوا کو چیرتی ہوئی اس کے پاس سے گذر گئی۔ پھر ایک دھماکہ ہوا، اور گولی اس کی زیریں پسلیوں کو توڑتی ہوئی بڑھ گئی۔ گرم گرم اُبلتا ہوا خون جھاگ کی طرح اس کے منہ میں بھر آیا، وہ اُونچی گھاس کی طرف بھاگا، تاکہ اس میں بیٹھ کر اُن کی نظروں سے اوجھل ہو جائے اور جب وہ اس دھماکے کے پیدا کرنے والی شے کو لے کر اس کے کافی نزدیک آجائیں تو جھپٹ کر اس آدمی کو پکڑ لے جو اُسے اٹھائے ہوئے ہے۔

میکومبر نے کار سے نکلتے وقت شیر کے احساسات کے متعلق سوچا ہی نہ تھا۔ اُسے صرف اتنا معلوم تھا کہ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور جب وہ کار کو چھوڑ کر آگے بڑھ رہا تھا تو اُسے قدم اٹھانا محال ہو گیا تھا۔ اس کی رانیں اکڑی ہوئی تھیں لیکن ان کے پٹھے پھڑپھڑاتے ہوئے اسے محسوس ہو رہے تھے۔ اس نے رائفل اُونچی کی۔ سر اور کندھوں کے جوڑ کا نشان لیا۔ اور گھوڑا دبا دیا۔ اس نے اتنے زور سے لبلبی کو کھینچا تھا کہ اسے خیال ہوا شاید انگلی ہی ٹوٹ جائے گی لیکن رائفل نہ چلی۔ اب اُسے یاد آیا کہ حفاظتی کمانی چڑھی ہوئی تھی۔ اور جب اس نے کمانی کو ہٹانے کے لیے رائفل نیچے کی تو اکڑی ہوئی

ٹانگوں سے زور لگا کر ایک قدم اور آگے بڑھ گیا۔ شیر نے جب اس کا سایہ کار کے سائے سے الگ دیکھا، تو دوسری طرف مڑ کر بھاگنا شروع کر دیا اور جب میسکومبر نے بندوق داغی تو اس نے ایسی آواز سنی جیسے گولی ٹھیک نشانے پر بیٹھی ہے۔ لیکن شیر بھاگتا رہا۔ میکومبر نے دوسری گولی چلائی۔ ... تو بھاگتے ہوئے شیر سے پرے سب نے مٹی کا ایک غبار اُڑتے دیکھا۔ اس نے تیسری گولی چلاتے ہوئے نالی کو ذرا جھکا دیا، تو گولی پھر نشانے پر بیٹھی۔ شیر کی رفتار تیز ہو گئی اور وہ کھٹکے کو آگے سرکانے سے پہلے ہی لمبی گھاس میں پہنچ گیا۔

میسکومبر کے معدے میں اِبتلا ہو رہا تھا اور وہ سپرنگ فیلڈ کو ہاتھوں میں تھامے گھبرایا ہوا کھڑا تھا۔ اور کانپ رہا تھا۔ اُس کی بیوی اور رابرٹ ولسن دونوں اس کے پاس کھڑے تھے۔ دونوں بندوق بردار بھی اس کے پاس کھڑے تھے۔ وہ کامبا میں باتیں کر رہے تھے۔

"نشانہ ٹھیک بیٹھا ہے۔ میں نے دو مرتبہ ٹھیک نشانہ کیا ہے۔"

"تم نے اسے پیٹ میں گولی ماری ہے، اور کہیں آگے کے حصے میں۔"

ولسن نے بغیر کسی جوش کے کہا۔ بندوق برداروں کے چہرے اب سنجیدہ ہو گئے تھے اور وہ خاموش تھے۔

"ممکن ہے تم نے اسے مار ہی لیا ہو" وِلسن نے پھر کہا۔

"اس کی تلاش میں جانے سے پہلے ہمیں کچھ دیر انتظار کرنا ہو گا۔"

"تمہارا کیا مطلب ہے؟"

"پیچھا کرنے سے پہلے اُسے ذرا کمزور ہو جانے دو۔"

"اوہ" میکومبر نے کہا۔

"بہترین ہے" ولسن نے بڑی مسرت سے کہا۔ "اگرچہ بڑی خطرناک جگہ چھپا ہے۔"

"خطرناک کیوں؟"

"ہم اسے دیکھ نہ سکیں گے جب تک اس کے اوپر ہی نہ جا پہنچیں۔"

"اوہ" میکومبر نے پھر کہا۔

"آؤ" ولسن نے کہا "میم صاحب کار میں ٹھہریں گی، اور ہم ذرا آگے بڑھ کر خون کے نشان دیکھیں گے۔"

"تم یہاں ٹھہرو مارگریٹ" میکومبر نے اپنی بیوی سے کہا۔ اس کا منہ اتنا خشک ہو رہا تھا کہ بات کرنا محال تھی۔

"میں کیوں ٹھہروں؟" وہ بولی۔

"ولسن کا کہنا ہے۔"

"ہم ذرا معائنے کے لیے جا رہے ہیں" ولسن نے کہا۔ "تم یہیں ٹھہرو، یہاں سے سب کچھ اچھی طرح نظر آئے گا۔"

"بہت اچھا"

ولسن نے سواحیلی زبان میں ڈرائیور سے کچھ کہا۔ اس نے سر ہلایا اور کہا "بہت اچھا بوانا۔"

پھر وہ ڈھلوان کنارے پر سے اتر کر ندی پار گئے۔ اور چٹانوں پر چڑھتے اور ان کے گرد گھومتے ہوئے دوسرے کنارے پر درختوں کی جڑوں کے سہارے چڑھ گئے۔ یہاں انہوں نے اس جگہ کو دیکھا جہاں پہلا نشانہ کرتے وقت شیر بھاگ رہا تھا۔ یہاں بندوق برداروں نے چھوٹی چھوٹی گھاس کی پتیوں پر گہرے رنگ کے خون کے نشان دکھائے جو ندی کے کنارے

درختوں کے پیچھے کی طرف چلے جاتے ہیں۔

"اب کیا کرنا ہے" میکومبر نے پوچھا۔

"اس کا انحصار ہماری مرضی پر منحصر نہیں" ولسن نے جواب دیا "ہم کار تو یہاں لا نہیں سکتے۔ کنارے کی ڈھلان بڑی زیادہ ہے۔ ذرا اس کے اعضا کو اکڑ جانے دو پھر تم اور میں اندر جا کر اسے ڈھونڈیں گے"

"ہم گھاس کو آگ نہ لگا دیں؟" میکومبر نے پوچھا۔

"گھاس تو سبز ہے"

"ہانکنے والوں کو کیوں نہ بھیج دیں؟"

ولسن نے اس کی طرف ایسے دیکھا جیسے جانچ رہا ہو۔ "ہاں ہم ہانکنے والوں کو بھیج تو سکتے ہیں لیکن یہ ذرا قاتلوں کا سا کام ہے ہمیں معلوم ہے کہ شیر زخمی ہو چکا ہے۔ ہم ایسے شیر کو تو ہانک سکتے ہیں جو زخمی نہ ہو ـــ کیونکہ شور سنکر وہ آگے آگے چل پڑے گا ـــ لیکن زخمی شیر حملہ کرتا ہے تو اس وقت تک اسے نہیں بھانپ سکتے، جب تک کہ عین اس کے سر پر نہ پہنچ جائیں۔ وہ اتنی سی اوٹ میں بھی چھپا رہے گا۔ جس میں تمہیں ایک خرگوش کے چھپنے کا بھی امکان نظر نہ آئے۔ اس قسم کے حالات میں تم ان چھوکروں کو کیسے بھیج سکتے ہو کسی نہ کسی کو وہ چیر پھاڑ دے گا۔"

"اگر بندوق بردار وں کو بھیج دیں تو؟"

"وہ ہمارے ساتھ ضرور جائیں گے۔ یہ اُن کا فرض ہے اور ملازمت کے اقرار نامے میں لکھا جاتا ہے۔ لیکن وہ اس فرض کی بجا آوری کے لیے کوئی زیادہ خوش نظر نہیں آتے، دیکھ لو۔"

"میں اُن جھاڑیوں میں جانا نہیں چاہتا۔" یہ بات اُس کے منہ سے ایسی

بے ساختہ نکل گئی۔ کہ اُسے معلوم بھی نہ ہُوا۔

"جانا تو میں بھی نہیں چاہتا،" ولسن نے ہنستے ہوئے کہا۔ "لیکن اب اس کے سوائے اور کوئی چارہ بھی نہیں۔" اسے بعد میں خیال آیا تو اُس نے میکومبر کی طرف دیکھا۔ اس پہ رعشہ طاری تھا۔ اور اس کا چہرہ قابلِ رحم بن رہا تھا۔

"تمہارا ان جھاڑیوں میں جانا ضروری بھی نہیں ہے۔" یہ میرا فرض ہے، انہی باتوں کی اُجرت تو میں لیتا ہوں۔ اور یہی وجہ ہے کہ میری اُجرت اتنی زیادہ ہے۔"

تمہارا مطلب ہے کہ تم اکیلے جاؤ گے؟ اسے وہیں کیوں نہ رہنے دیا جائے؟"

رابرٹ ولسن اب تک ... ہی میں منہمک تھا اور اس مسئلے میں جو اس وقت پیش نظر تھا۔ اس نے میکومبر کی قابل رحم حالت پہ دھیان ہی نہ دیا تھا۔ یکایک اُسے یوں محسوس ہُوا جیسے اس نے کسی ہوٹل میں غلطی سے کسی دوسرے کا دروازہ کھول لیا ہے اور کوئی شرمناک بات دیکھ لی ہے۔

"تمہارا مطلب کیا ہے؟"

"اسے یہیں کیوں نہ چھوڑ دیں؟"

"تمہارا مطلب ہے ہم اپنے آپ کو یہ سمجھا لیں کہ وُہ زخمی ہی نہیں ہُوا ہے؟"

"نہیں بس چھوڑ دیں۔"

"یہ بات شکار کے اصول کے خلاف ہے۔"

"آخر کیوں؟"

"پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ دُکھ میں مبتلا رہے گا۔ دُوسری یہ کہ کوئی بے خبری میں اُدھر جا نکلے تو"

"اب سمجھا"

"لیکن اب تمہیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے"

"لیکن میں کرنا چاہتا ہوں" میکومبر نے کہا۔ "میں بس ذرا خوفزدہ ہو گیا تھا"

"جب ہم جھاڑیوں میں داخل ہوں گے تو میں آگے آگے چلوں گا" ولسن نے کہا "کونگونی اس کے نشان تلاش کرنے کے لیے ساتھ ہوگا۔ تم میرے پیچھے پیچھے رہنا اور ذرا ایک طرف کو۔ اس بات کا بڑا امکان ہے کہ ہم اُس کے غرانے کی آواز سُن لیں۔ اگر ہم نے اُسے دیکھ لیا تو ہم دونوں اکٹھے گولی چلائیں گے۔ تم کسی قسم کا فکر نہ کرو ——— میں تمہاری مدد کے لیے تیار رہوں گا۔ حقیقت یہ ہے، اگر تم نہ جاؤ تو زیادہ اچھی بات ہے۔ ممکن ہے بہت ہی اچھی بات ہو۔ تم میم صاحب کے پاس کیوں نہیں جا بیٹھتے۔ میں یہ قضیہ خود بھگت لوں گا۔"

"نہیں۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔"

"بہت بہتر" ولسن نے کہا۔ "لیکن اگر تم جانا نہیں چاہتے تو نہ جاؤ۔ اب یہ میرا فرض ہے"

"میں جانا چاہتا ہوں"

وہ ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر تمباکو پیتے رہے۔

"جب تک ہم بیٹھے ہیں، تم چاہو تو جا کر میم صاحب سے باتیں کر آؤ"

"نہیں، اس کی کیا ضرورت ہے"

"تو میں پھر انہیں جا کر بتا آؤں کہ ابھی دیر ہے۔ صبر سے انتظار کریں"
"بہت اچھا" میکومبر نے کہا۔ درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے اس کی بغلوں میں پسینہ پھوٹ رہا تھا، منہ خشک تھا، معدہ خالی محسوس ہو رہا تھا۔ اور وہ اتنی ہمت مجتمع کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ولسن سے اتنا ہی کہہ سکے کہ وہ اس کے بغیر ہی جا کر شیر کا کام تمام کر آئے۔ حالانکہ ولسن اس بات پہ پیچ و تاب کھا رہا تھا کہ اس نے اس کی حالت کو پہلے کیوں نہ بھانپ لیا۔ اور اسے اس کی بیوی کے پاس کیوں نہ بھیج دیا۔ اس کے بیٹھے بیٹھے ولسن واپس آ گیا "میں تمہاری بڑی بندوق لے آیا ہوں۔ یہ لو، میرا خیال ہے کہ ہم نے اسے کافی وقت دے دیا ہے۔ آؤ، اب چلیں"
میکومبر نے بڑی بندوق تھام لی اور ولسن پھر بولا "میرے پیچھے پیچھے رہو۔ اور تقریباً پانچ گز داہنی طرف اور جو کچھ میں کہوں اس کی پوری طرح تعمیل کرنا" پھر اس نے دونوں سواحیلی بندوق برداروں سے کچھ باتیں کیں جو بڑے مغموم چہرے بنائے کھڑے تھے۔
"آؤ چلیں" انہوں نے کہا۔
"ذرا سا پانی پی لوں؟" میکومبر نے پوچھا۔ ولسن نے بڑے بندوق بردار سے کہا جس نے اپنی پیٹی میں سے پانی کی چھاگل کھول کر اور اس کی ڈاٹ اتار کر میکومبر کے ہاتھ میں دے دی۔ میکومبر کو وہ بڑی بھاری معلوم ہو رہی تھی۔ اور چھاگل پر لپٹی ہوئی بانات کے روئیں کھردرے اور ملیے ملیے محسوس ہو رہے تھے۔ اس نے بوتل منہ سے لگا لی اور اونچی اونچی گھاس اور اس کے پیچھے درختوں کو تاکنے لگا جن کی شاخیں چھتری کی طرح پھیلی ہوئی تھیں۔ ہوا کا رُخ انہی کی طرف تھا جس سے گھاس میں ہلکی سی سرسراہٹ

پیدا ہوئی۔ اس نے بندوق بردار کی طرف دیکھا اور سمجھ گیا کہ وہ بھی اسی کی طرح خوفزدہ ہو رہا ہے۔
گھاس میں پینتیس گز کے فاصلے پر وہ قوی ہیکل شیر زمین پر بچھا پڑا تھا،
اس کے کان پیچھے کی طرف مڑے ہوئے تھے اور اس کے جسم میں صرف اتنی
حرکت تھی کہ اس کی لمبی سیاہ، گچھے دار دم میں، نیچے سے اوپر تک ہلکی سی جنبش
ہو رہی تھی۔ شیر اس جگہ پہنچتے ہی حملے کے لئے تیار ہو بیٹھا تھا۔ وہ پیٹ کے
زخم کی وجہ سے بیزار تھا۔ اور پھیپھڑوں کے زخم کی وجہ سے ہر سانس کے ساتھ
اس کے منہ میں سرخ رنگ کے جھاگ آجاتے تھے۔ اس کی پسلیاں خون سے
تر اور درد سے جل رہی تھیں۔ اور جہاں اس کی گندمی کھال کو ادھیڑ کر گولی
داخل ہوئی تھی، مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ اس کی بڑی بڑی زرد آنکھیں غصے
اور نفرت سے سکڑی ہوئی تھیں۔ وہ سامنے کی طرف دیکھ رہا تھا اور صرف
اس وقت آنکھیں جھپکتا تھا جب درد کی شدت سے بے تاب ہو جاتا تھا۔
اس کے پنجے نرم اور خشک مٹی میں گڑے جا رہے تھے، وہ درد اور غصے
کا مجسمہ بنا بیٹھا تھا، اور اس کی ساری باقی ماندہ قوت صرف ایک آخری حملے کے لئے
مجتمع ہو رہی تھی۔ وہ آدمیوں کو باتیں کرتے ہوئے سن رہا تھا۔ اور حملہ کرنے
کے لیے اس انتظار میں تھا کہ کب یہ لوگ گھاس میں داخل ہوتے ہیں۔ جونہی اس نے ان کی آواز
نزدیک آتی ہوئی سنی اس کی دم کوڑے کی طرح سنسنانے اور گرنے لگی، اور پھر جونہی
وہ گھاس کے کنارے تک پہنچے۔ وہ غراتا ہوا اٹھا اور ان پر حملہ کر دیا۔
کانگونی، پرانا بندوق بردار خون کے نشانات دیکھتا ہوا جا رہا تھا، ولسن
اپنی بڑی بندوق سنبھالے گھاس میں کسی حرکت کا جویا تھا۔ دوسرا بندوق بردار
آگے کو نظر بڑھائے، کانوں پر آواز لگائے ہوئے تھا، میکومبر ولسن کے ساتھ
ساتھ بندوق کا گھوڑا چڑھائے بڑھ رہا تھا۔ جونہی وہ گھاس کی حدود میں

داخل ہوتے میکومبر نے شیر کے خون سے بھرے ہوئے گلے کی غراہٹ سنی اور گھاس میں اس کی دُم کو کوڑے کی طرح چلتی دیکھی۔ دوسری بات جو اُسے یاد رہی، یہ تھی کہ وہ بھاگ رہا تھا۔ اندھا دھند پاگلوں کی طرح، خوفزدہ ہو کر دریا کی سمت کھلی جگہ کی طرف بھاگ رہا تھا۔

ولسن کی بڑی رائفل سے "کراواآنگ" کی آواز بلند ہوئی۔ اور پھر ایک اور "کراواآنگ" کی سی گرج پیدا ہوئی۔ میکومبر نے سر پھیر کر دیکھا تو شیر کی ہیبت ناک صورت دکھائی دی۔ اس کا آدھا سر اڑ گیا تھا، اور ولسن کی طرف رینگتا ہوا بڑھ رہا تھا جو گھاس کے کنارے قدم جمائے کھڑا تھا۔ سرخ چہرے والے آدمی نے اپنی بدنما چھوٹی سی بندوق کا گھوڑا پھر چڑھایا اور بڑے اطمینان سے نشانہ لیا۔ "کراوانگ" کی ایک اور آواز اس کی نالی سے گونجی اور اس کے ساتھ ہی شیر کا زرد جسم بے حس ہو گیا۔ اور اس کا شاندار کٹا پھٹا سر آگے کو لڑھک گیا۔ میکومبر بھری ہوئی رائفل لیے کھلی جگہ میں جہاں وہ بھاگ کر پہنچا تھا، سہما کھڑا تھا اور دو حبشی اور ایک سفید فام آدمی اس کی طرف حقارت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ سمجھ گیا کہ شیر مر چکا ہے، وہ ولسن کی طرف آیا۔ اس کا لمبا قد ملامت کا ایک برہنہ مجسمہ معلوم ہوتا تھا، ولسن نے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا "تصویر لو گے؟"

"نہیں" اُس نے جواب دیا۔

موٹر کار تک پہنچنے تک صرف اتنی ہی گفت گو ان کے درمیان ہوئی پھر ولسن بولا۔

"بڑا ہی شاندار شیر ہے، چھوکرے اس کی کھال اتار لیں گے۔ آؤ ہم یہاں سائے میں بیٹھیں۔"

نہ میکومبر کی بیوی نے اس کی طرف دیکھا اور نہ اس نے بیوی سے نظریں ملائیں۔ حالانکہ وہ پچھلی نشست پر اس کے ساتھ بیٹھا تھا اور ولسن اگلی نشست پر تھا۔ ایک دفعہ اس نے بیوی کی طرف نظریں اُٹھائے بغیر اس کا ہاتھ پکڑ لیا لیکن اس نے نفرت سے چھڑا لیا۔ ندی کے پار جب اس نے اس طرف نظر دوڑائی جہاں حبشی شیر کی کھال اتار رہے تھے تو اُسے معلوم ہو گیا کہ وہ یہاں سے سب کچھ صاف طور پر دیکھتی رہی ہے۔ وہیں بیٹھے ہوئے اس کی بیوی نے اپنا ہاتھ بڑھا کر ولسن کے کندھے پر رکھ دیا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو میکومبر کی بیوی نے آگے کو جھک کر اس کے لبوں کو چوم لیا۔

"اوہ، یہ کیا" کہتے ہوئے ولسن کا چہرہ پہلے سے بھی زیادہ سرخ ہو گیا۔

"مسٹر رابرٹ ولسن" وہ بولی۔ "سرخ چہرے والا حسین رابرٹ ولسن"

پھر وہ میکومبر کے ساتھ بیٹھ گئی اور اس طرف دیکھنے لگی جہاں ندی کے پار شیر پڑا تھا۔ جوں جوں حبشی کھال اُتارتے جاتے اس کی اگلی ٹانگوں کے سفید سفید پٹھے اور نسیں، پھولا ہوا سفید پیٹ برہنہ ہوتا جاتا۔ آخر کار بندوق بردار اس کی گیلی اور بھاری کھال اٹھا لائے۔ اُسے لپیٹ کر کار کے پچھلی طرف رکھ دیا۔ اور خود بھی چڑھ کر بیٹھے۔ کار روانہ ہو گئی کیمپ میں واپس پہنچنے سے پہلے کسی نے بات نہ کی۔

یہ تھا شیر کا قصہ۔ میکومبر کو معلوم نہ تھا کہ حملہ کرنے سے پہلے شیر کے احساسات کیا تھے۔ نہ اس وقت کے احساسات کا علم تھا جب ۵۰۵ کی گولی دو ٹن کی طاقت کے ساتھ رائفل سے نکل کر اس کے منہ میں لگی تھی نہ اُسے

یہ بات معلوم تھی کہ وہ کیا چیز تھی۔ جس نے اُسے پچھلے کوئلوں پر گولی کھا لینے کے باوجود بڑھتے ہی رہنے پر مجبور کیے رکھا۔ یہاں تک کہ وہ رینگ رینگ کر بھی اس گرجنے اور کڑکنے والی شے کی طرف بڑھتا ہی رہا جو اُسے فنا کرتی جا رہی تھی۔ ولسن کو تھوڑا بہت اس بات کا علم تھا، جس کا اظہار اس نے "بڑا ہی شاندار شیر ہے" کہہ کر کیا تھا۔ لیکن میکومبر کو یہ بھی معلوم نہ تھا، کہ ولسن کے اپنے احساسات کیا تھے۔ اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اس کی بیوی کے احساسات کیا ہیں، سوائے اس کے کہ وہ اس سے برگشتہ خاطر ہو چکی تھی۔

برگشتہ خاطری پہلے بھی کبھی کبھار ہو جایا کرتی تھی، لیکن جلد ہی ختم بھی ہو جاتی وہ بڑا امیر تھا، اب اس کی دولت میں اور بھی اضافہ ہونے والا تھا، اور اسے معلوم تھا کہ وہ اب اس کو کبھی نہ چھوڑے گی جن باتوں کے متعلق اسے یقینی علم تھا، یہ بھی ان میں سے ایک بات تھی۔ اُسے اس کا بھی علم تھا۔ اور موٹر سائیکلوں کے متعلق بھی۔ اگرچہ یہ دیر کی بات ہے۔ موٹر کاروں کے متعلق .... مرغابیوں کے شکار کے متعلق، ٹراؤٹ سامن اور وسیع سمندر میں مچھلیوں کے شکار کے متعلق، کتابوں میں لکھی ہوئی جنسیات کے متعلق۔ جنسیات کے متعلق اس نے بے شمار کتابیں پڑھ ڈالی تھیں۔ اور پھر گھریلو کھیلوں کے متعلق۔ کتوں کے متعلق، گھوڑوں کے متعلق اس کے معلومات محدود تھے، اپنی دولت سے چمٹے رہنے کے متعلق۔ اور بہت سی ایسی باتیں جو اس کی اپنی کاروباری دنیا سے متعلق تھیں۔ اور اس کے ساتھ اسے یہ بھی علم تھا کہ اس کی بیوی اسے چھوڑ کر کہیں نہ جائے گی۔ وہ بڑی حسین گنی جاتی تھی، اور اب بھی افریقہ میں اس کا شمار بڑی حسیناؤں میں تھا لیکن اپنے وطن میں وہ اب اتنی حسین نہ سمجھی جاتی تھی، کہ اسے چھوڑ کر کوئی بہتر گھر

لبا لے۔ وہ خود بھی اس بات کو جانتی تھی۔ اور وہ بھی سمجھتا تھا۔ وہ اسے چھوڑنے کا موقع گنوا چکی تھی، اور وہ اس بات کو بھی جانتا تھا۔ اگر وہ عورتوں کے معاملے میں ہی کچھ ہوشیار ہوتا تو وہ اس بات کا ضرور فکر شروع کر دیتی، کہ کسی اور حسین عورت سے شادی نہ کر لے۔ لیکن وہ اس ضمن میں اتنا کچھ جانتی تھی کہ اس کا فکر کرنے کی بھی ضرورت نہ تھی۔ اس کے علاوہ اس میں برداشت کا مادہ حد سے زیادہ تھا۔ اس کی اس صفت کو اگر منحوس ترین نہیں تو پھر کیا نفیس ترین کہا جاتا۔

بہ حیثیت مجموعی یہی سمجھا جاتا تھا کہ وہ اپنی بیاہتا زندگی میں مقابلۃً بڑا مطمئن جوڑا ہے۔ ایسا جوڑا جس کی "نااتفاقی کی افواہیں تو اُڑتی رہتیں لیکن کبھی جدائی واقع نہ ہوتی۔ طبقۂ امراء کے مراسلہ نگار لکھ رہے تھے کہ وہ اپنی پُراز رشک اور پائیدار رومانی زندگی کو تاریک ترین افریقہ کے شکاری سفر سے اور زیادہ پُر لطف بنا رہے ہیں۔ اس معاملے نے یہاں تک شہرت حاصل کی کہ مارٹن جانسنز نے پردۂ سیمیں پر وہ تصویریں دکھانی شروع کر دیں جن میں وہ شیر، بھینسے اور ہاتھی کا شکار کرتے ہوئے دکھائے گئے تھے اور تاریخ فطرت کے عجائب خانے کے لیے بیش بہا نوادر اکٹھے کر رہے تھے۔ اسی نامہ نگار نے یہ بھی لکھا کہ کم از کم تین مرتبہ ایسے حالات پیدا ہو چکے ہیں کہ جدائی تک نوبت جا پہنچی۔ لیکن وہ ہر مرتبہ صلح کر لیتے رہے۔ ان کے پاس اتحاد و اتفاق کی معقول وجوہات تھیں۔ مارگریٹ اتنی خوبصورت تھی کہ میکومبر اسے طلاق نہ دے سکتا۔ اور میکومبر کے پاس اتنی دولت تھی کہ مارگریٹ اسے چھوڑ نہ سکتی تھی۔

اب صبح کے تین بج چکے تھے اور فرانسس میکومبر جو شیر کے خیال کو بھول

کر تھوڑی دیر کے لئے سو گیا تھا۔ بیدار ہوا اور پھر سو گیا۔ پھر خون سے لتھڑے ہوئے شیر کو خواب میں دیکھ کر گھبرایا ہوا جاگا۔ اور اپنے دھڑکتے ہوئے دل کی آواز سننے لگا۔ اس نے دیکھا کہ اس کی بیوی خیمے میں دوسری چارپائی پر موجود نہیں ہے۔ یہ دیکھ کر اُسے دو گھنٹے تک نیند نہ آئی۔

اس عرصے کے بعد اس کی بیوی چپکے سے خیمے میں داخل ہوئی۔ مسہری کا پردہ اٹھایا اور آرام سے بستر پر لیٹ گئی۔

"تم کہاں تھیں"؟ میکومبر نے اندھیرے میں پوچھا۔

"اوہو، تم جاگ رہے ہو؟"

"میں پوچھتا ہوں تم کہاں تھیں؟"

"میں ذرا تازہ ہوا کھانے باہر نکل گئی تھی۔"

"اچھا ہوا کھانے، جہنم کی۔"

"تم مجھ سے کیا کہلوانا چاہتے ہو پیارے؟"

"تم کہاں گئی تھیں۔؟"

"باہر تازہ ہوا کھانے۔"

"اس کے لیے تم نے ایک نیا نام تجویز کیا ہے۔ تم کتیا ہو گئیا۔"

"بہت اچھا، تم ایک نامرد ہو۔ سُن لیا؟"

"یہی سہی، لیکن تمہارا اس سے مطلب؟"

"کچھ بھی نہیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، لیکن پیارے بے فائدہ باتیں کرنے سے حاصل۔ مجھے بڑی نیند آرہی ہے۔"

"تم سمجھتی ہو کہ میں ہر بات برداشت کرتا چلا جاؤں گا۔؟"

"ہاں میرے محبوب تم ضرور برداشت کروگے۔"

"میں نہیں کروں گا۔"

"تو پیارے سو جاؤ۔ باتیں نہ کرو۔ مجھے بڑی نیند آرہی ہے۔"
"اب تو تمہیں ایسی کوئی حرکت نہ کرنی تھی۔ تم نے وعدہ کیا تھا کہ اب ایسی بات نہ کروگی؟"
"لیکن اب تو کرلی ہے" اس نے بڑے پیارے انداز میں کہا۔
"تم نے کہا تھا کہ اگر ہم اس سیر کے لیے آئیں گے۔ تو پھر کوئی ایسی حرکت نہ ہوگی، تم نے پختہ وعدہ کیا تھا"
ہاں پیارے میری بھی یہی نیت تھی۔ لیکن کل کے واقعہ نے سب کچھ برباد کر دیا۔ ہمیں اس کا ذکر نہ کرنا تھا۔ ٹھیک ہے نا؟"
"جب تمہیں کوئی موقع ملتا ہے۔ تو صبر کا دامن چھوٹ جاتا ہے۔"
"خدا کے لیے خاموش ہو جاؤ پیارے، مجھے بڑی نیند آرہی ہے۔"
"میں ضرور بولوں گا۔ سُنا؟"
"تو پھر میرا خیال نہ کرنا۔ میں سوتی ہوں؟" اور وہ سچ مچ سو گئی۔
"صبح روشنی پھیلنے سے پہلے وہ تینوں ناشتے کی میز پر موجود تھے۔"
فرانسس میکومبر نے محسوس کیا کہ اپنی ساری زندگی میں جن لوگوں سے اس نے نفرت کی ہے، رابرٹ ولسن اُن سب سے زیادہ قابلِ نفرت ہے۔
"خوب سوئے؟" ولسن نے اپنی گمبھیر آواز میں پائپ بھرتے ہوئے پوچھا۔
"اور تم؟"
"بڑے مزے میں" سفید فام شکاری نے کہا۔
حرامی پلّے میکومبر نے دل میں کہا۔ گستاخ حرامی پلّے۔
اچھا تو اس نے خیمے میں داخل ہوتے ہوئے اُسے جگا دیا ہوگا۔ ولسن نے دل میں سوچا۔ اور ان دونوں کی طرف اپنی چیلی اور جذبات سے عاری

آنکھوں سے دیکھا۔ یہ اپنی بیوی کو قابو میں کیوں نہیں رکھتا۔ کیا یہ سمجھتا ہے کہ میں پتھر کا بت ہوں؟ اسے قابو میں رکھے۔ اس کی اپنی غلطی ہے۔

"تمہارا کیا خیال ہے ہمیں بھینسیں مل جائیں گی۔" مارگریٹ نے خوبانیوں کی پلیٹ پرے دھکیلتے ہوئے پوچھا۔

"ملنے کا امکان ہے۔" ولسن نے مسکراتے ہوئے کہا "تم کیمپ ہی میں کیوں نہیں ٹھہر تیں؟"

"کسی قیمت پر بھی نہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"اسے حکم کیوں نہیں دیتے کہ کیمپ ہی میں ٹھہرے؟" ولسن نے میکومبر سے کہا۔

"تم ہی اسے حکم دو۔" میکومبر نے خشکی سے جواب دیا۔

"حکم وکم چھوڑ دیئے۔" اور پھر میکومبر کی طرف مڑ کر "اور نہ کوئی فضول بات کیجیے۔"

"چلنے کے لیے تیار ہو؟" میکومبر نے پوچھا۔

"بالکل تیار ہوں۔" ولسن نے جواب دیا "میم صاحب کو بھی ساتھ لے جانا چاہتے ہو؟"

"میرے لے جانے یا نہ لے جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" اس نے جواب دیا۔

جہنم میں جاتے ہیں۔ میکومبر نے دل میں کہا۔ جلتی دہکتی جہنم کی آگ میں۔ یہ نتیجہ نکلا ہے آخر۔ دیکھو یہ نتیجہ نکلا ہے آخر کار۔

"کوئی فرق نہیں پڑتا۔" اس نے پھر کہا "تم یہ تو نہیں چاہتے کہ میں بھینسوں کے شکار کے لیے اکیلا چلا جاؤں اور تم اس کے ساتھ کیمپ میں

ٹھہرو۔؟"

"میں ایسا نہیں کر سکتا" ولسن نے کہا "اور اگر میں تمہاری جگہ ہوتا۔ تو ایسی بے ہودہ بات زبان پر کبھی نہ لاتا"

"میں بے ہودہ بات نہیں کر رہا۔ میں تنفر ہو گیا ہوں"

"برا لفظ ہے یہ، تنفر ہوتا"

"فرانسس، خدا کے لیے عقل کی بات کرو" اس کی بیوی نے کہا۔

"عقل ہی کی بات کر رہا ہوں" میکومبر نے کہا "کتنا غلیظ کھاتا ہے یہ"

"کھانے میں کچھ نقص ہے؟" ولسن نے بڑے سکون سے پوچھا۔

"صرف کھانے ہی میں نہیں، ہر چیز میں نقص ہے"

"اپنے آپ پر ذرا قابو رکھو" ولسن نے پُرسکون لہجے میں کہا "ملازموں میں ایک چھوکرا تھوڑی بہت انگریزی سمجھتا ہے"

"جہنم رسید کرو اسے"

ولسن پائپ کے کش لیتا ہوا کھڑا ہو گیا اور ذرا پرے جا کر سواحیلی زبان میں بندوق برداروں میں سے ایک کے ساتھ باتیں کرنے لگا میکومبر اور اس کی بیوی میز پر بیٹھے رہے۔ وہ اپنی کافی کے پیالے پہ نظریں جمائے ہوئے تھا۔

"اگر تم دوسروں کے سامنے اس طرح شور مچاؤ گے تو میں تمہیں چھوڑ دوں گی پیارے"

"نہیں تم ہرگز نہ چھوڑ دگی"

"تو پھر تم آزما کے دیکھ لو"

"تم مجھے نہیں چھوڑو گی"

"اگر تم انسان بنے رہو گے تو نہیں چھوڑوں گی۔"

"میں انسان بنا رہوں؟ کیا خوب بات کہی ہے۔ میں انسان بنا رہوں۔"

"ہاں ہاں، تم انسان بنے رہو۔"

"تم انسان بننے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں؟"

"میں تو بڑی دیر تک بنی رہی ہوں۔ بڑی دیر تک"

"مجھے اس سرخ چہرے والے سؤر سے نفرت ہو گئی ہے"، میکومبر نے کہا۔ "بے انتہا نفرت ہو گئی ہے۔"

"وہ تو بے انتہا نفیس آدمی ہے۔"

"خاموش رہو"، میکومبر نے چیخ کر کہا۔ عین اس وقت کار خیمے کے سامنے آکر رکی اور اس میں سے ڈرائیور اور دونوں بندوق بردار اترے۔ ولسن ان میاں بیوی کے نزدیک آگیا۔ جو ابھی تک میز پر بیٹھے ہوئے تھے۔

"شکار کے لیے چلو گے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں" میکومبر نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا "ضرور جائیں گے۔"

"کوئی اونی کپڑا پہن لو۔ کار میں سردی محسوس ہو گی"، ولسن نے کہا۔

"میں اپنا چمڑے کا جیکٹ لیے لیتی ہوں"، مارگریٹ بولی۔

"جیکٹ چھوکرے نے ساتھ رکھ لیا ہے"، وہ ڈرائیور کے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھ گیا اور فرانسس میکومبر اور اس کی بیوی پچھلی نشست پر۔ وہ دونوں خاموش تھے۔

یہ نیم پاگل عورت کہیں پیچھے سے میرا سر ہی نہ اڑا دے۔ ولسن نے دل میں سوچا۔ شکار کے دوران میں یہ عورتیں ہمیشہ فساد برپا کر دیتی ہیں۔

صبح کے دھندلکے میں کار کنکریلے دریا کے کنارے پر سے رگڑتے ہوئے

اترے اور پھر وہ دوسرے کنارے کی گھاٹی پر اس پگڈنڈی پر سے چڑھنے لگی جسے ولسن نے کل ہی بیلچوں کے ذریعے صاف کرا دیا تھا تاکہ وہ گھاس کے اس کشادہ قطعے تک پہنچ جائیں جو دریا سے کچھ فاصلے پر واقع تھا۔

شکار کے لیے بڑا موزوں دن ہے۔ ولسن نے سوچا۔ رات اوس بھی خوب پڑی تھی جب کار کے پہیئے گھاس اور چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں پر سے گزرتے تو مسلی ہوئی نرم و نازک پتیوں کی خوشبو آتی۔ ایسے صبح کے سہانے وقت میں اوس کی یہ وربینا کی سی خوشبو۔ مسلے ہوئے فرن۔ صبح کے دھندلکے میں درختوں کے کالے کالے تنے، اس مرغزار پر سے پھسلتی ہوئی کار میں بیٹھ کر دیکھنے کا بڑا لطف آرہا تھا۔ پچھلی نشست پر بیٹھے ہوئے دونوں میاں بیوی اس کے ذہن سے اتر چکے تھے۔ وہ اب بھینسوں کے متعلق سوچ رہا تھا جبھینسیں جن کی تلاش میں وہ اس وقت جا رہا تھا، دن بھر دلدلوں میں چھپی رہتی تھیں۔ جہاں انہیں مارنا ناممکن تھا۔ لیکن رات کے وقت وہ کھلی زمین میں چرتی رہتی تھیں۔ اور اگر اس دلدل اور چراگاہ کے درمیان کار کے ذریعے بروقت پہنچا جا سکے۔ تو کھلی جگہ میں شکار کا بڑا عمدہ موقع حاصل ہو سکتا ہے۔ وہ گھنے سایوں میں میکومبر کے ساتھ بھینسوں کا شکار کرنا چاہتا تھا۔ بھینسیں ہوں یا کچھ اور، وہ میکومبر کے ساتھ شکار کرنا ہی چاہتا تھا۔ لیکن وہ ایک پیشہ ور شکاری تھا۔ اور اسے بڑے بڑے عجیب لوگوں کے ساتھ شکار کرنے کا اتفاق ہوا تھا۔ آج اگر بھینس کا شکار ہو گیا تو اس کے بعد صرف گینڈے کا شکار رہ جائے گا۔ ممکن ہے یہ خطرناک موقع بھی بخیر و خوبی گزر جائے۔ اور اس کے حالات رفتہ رفتہ ٹھیک ہو جائیں۔ پھر اس عورت سے بھی مخلصی حاصل ہو جائے گی۔ اور میکومبر اس کے ساتھ صلح کر لے گا۔ حالات

سے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ ایسے کئی مواقع پہلے بھی پیش آ چکے ہیں۔ بے چارہ میکو مبر۔ وہ کسی نہ کسی طرح ان باتوں کو بھلا ہی دیتا ہوگا۔ اس بارے معاملے میں میرا کیا قصور ہے۔

رابرٹ ولسن شکاری سفر کے دوران میں اپنے ساتھ ہمیشہ بڑی چارپائی رکھا کرتا تھا۔ محض اسی خیال سے کہ شاید کوئی ٹپک پڑے۔ وہ ایک خاص قسم کے گاہک منتخب کیا کرتا تھا۔ بین الاقوامی اور پکے کھلاڑی قسم کے گاہک، جن کی عورتیں اپنے روپے کے معاوضے میں، اس وقت تک مطمئن نہ ہوتی تھیں، جب تک وہ اس سفید فام شکاری کے بستر میں بھی سو نہ لیتیں۔ جب وہ رخصت ہو جاتیں تو اس کے دل میں اُن کے لیے نفرت و حقارت کے جذبات پیدا ہو جاتے، لیکن جب اُن سے تعلق ہوتا تو بعض کو وہ پسند بھی کرتا تھا۔ لیکن انہی عورتوں پر اس کا گزارا تھا، اور جب تک وہ ان کی ملازمت میں ہوتا۔ اُن کے اصول اِسے بھی اپنانے پڑتے۔

وہ اُن کے اصول قبول تو کر لیتا تھا لیکن شکار میں نہیں۔ شکار میں اس کے اپنے اصول تھے اور اس کے گاہکوں کو یا تو اُن کی پیروی کرتی پڑتی یا پھر اُسے چھوڑ دینا پڑتا۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ اسی اصول پرستی کی وجہ سے وہ مقبول ہے لیکن یہ میکو مبر کچھ عجیب قسم کا آدمی ہے۔ بڑا ہی عجیب، اور اس کی بیوی؟ ہاں اس کی بیوی، ہاں ہاں اس کی بیوی۔ ہاں ہاں اس کی بیوی۔ اس کی بیوی ــــ چلو چھوڑو اس بات کو۔ اُس نے مڑ کر ان کی طرف دیکھا۔ میکو مبر غصے سے بھرا بیٹھا تھا۔ مارگریٹ اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دی۔ آج وہ اور بھی چھوٹی عمر کی دکھائی دے رہی تھی، بڑی معصوم، شگفتہ، صرف حسین ہی نہیں، خدا معلوم اس کے دل میں اس وقت کیا ہے۔ ولسن نے سوچا کل رات اس نے

کوئی زیادہ بات چیت نہ کی تھی۔ اس سے مل کر بڑا ہی لطف آیا تھا
موٹر کار ہلکی سی گھاٹی پر چڑھی اور درختوں میں سے گھومتی ہوئی کھلے سبزہ زار کے کنارے کنارے درختوں کی اوٹ لیتے ہوئے آہستہ آہستہ بڑھتی چلی گئی۔ ولسن سبزہ زار کے دوسرے کنارے تک بڑے غور سے دیکھتا جارہا تھا۔ اس نے کار ڈرائیور اور دوربین کے ذریعے سارے میدان کا جائزہ لیا۔ موٹر پھر روانہ ہوئی اور گڑھوں اور چیونٹیوں کے گارے کے قلعوں سے بچتی ہوئی آہستہ آہستہ بڑھتی چلی گئی۔ میدان کے پار دیکھتے ہوئے ولسن یکایک مڑا، اور بولا۔
"خدا کی قسم وہ سامنے نظر آرہی ہیں۔"
میکومبر نے اس طرف دیکھا تو واقعی تین عظیم الجثہ کالے کالے حیوان سبزہ زار کے پرلی طرف بھاگتے ہوئے نظر آئے۔ ان کے جسم مشکیزوں کی طرح پھولے ہوئے اور دوڑتے ہوئے یوں دکھائی دیتے تھے، جیسے بڑے بڑے موٹر ٹینک چلے جا رہے ہیں۔ ولسن نے سواحیلی زبان میں جلدی سے ڈرائیور سے کچھ کہا، اور ساتھ ہی موٹر آگے کو جھپٹی۔ ان کی گردنیں اور جسم اکڑے ہوئے تھے۔ اور سر اوپر کو اٹھے ہوئے تھے۔ جن پر کالے کالے سینگ دونوں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ دوڑتے ہوئے وہ سر کو بھی نہ ہلاتے تھے۔
"تین جوان بھینسے ہیں،" ولسن نے کہا "ہم دلدل تک پہنچنے سے پہلے ان کا راستہ کاٹ لیں گے۔"
کار پینتالیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑی چلی گئی میکومبر کی نظروں کے سامنے ان کے جسم بڑے ہوتے جارہے تھے۔ یہاں تک کہ سب سے پچھلے بھینسے کی بھوری چمڑی نظر آنے لگی۔ جس پر بال نہ تھے۔ موٹاپے کی وجہ سے

اس کی گردن اور کندھے ایک ہو رہے تھے اور اس کے لمبے لمبے کالے سینگ چمک رہے تھے۔ کار ایسے جھول رہی تھی جیسے وہ کسی سڑک کو پھلانگ کر نکلی ہے اب وہ ان کے اور نزدیک پہنچ گئی۔ اس نے بھینسے کا عظیم الشان جسم دیکھا، جس کی جلد میں کہیں کہیں بال تھے اور اُن پر گرد جمی ہوئی تھی۔ اس کے پھیلے ہوئے سینگ اور چوڑے چوڑے نتھنے بھی نظر پڑ رہے۔ وہ اپنی رائیفل سیدھی کر رہا تھا کہ ولسن نے پکار کر کہا۔

"بیوقوف نہ بنو، کار میں سے شکار نہیں کیا جاتا" اب اس کے دل میں کوئی خوف نہ تھا، صرف ولسن کے لیے نفرت تھی۔ کار ایک دھچکے کے ساتھ ایک طرف ہو کر مڑی۔ ابھی وہ پوری طرح کھڑی بھی نہ ہوئی تھی کہ اس کے ایک دروازے سے ولسن نکلا، اور دوسرے سے میکومبر کودا۔ چلتی ہوئی کار میں سے اُترتے ہوئے اس کے قدم ڈگمگا گئے۔ وہ اپنی گولیوں کو بھینسے کے جسم میں اترتے ہوئے محسوس کرتا رہا۔ یہاں تک سارے کارتوس ختم ہو گئے بندوق کو دوبارہ بھرنے کے لیے کارتوس ٹٹولتے ہوئے اُسے یاد آیا، کہ گولی اس کے کندھوں میں مارنی چاہیئے تھی۔ یکایک بھینسا گھٹنوں کے بل گر گیا اور اپنا بڑا سر دائیں بائیں پٹخنے لگا۔ یہ دیکھ کر اس نے باقی دو بھینسوں میں سے اگلے کو گولی ماری۔ دوسری گولی خطا گئی، لیکن ساتھ ہی ولسن کی رائفل سے "کیراوانگ" کی گونج ہوئی، اور وہ منہ کے بل آ رہا۔

"تیسرے کو سنبھالو" ولسن نے کہا "اب تمہاری باری ہے"

لیکن یہ بھینسا اسی رفتار سے برابر بڑھتا جا رہا تھا۔ نشانہ خطا گیا، اور زمین پر سے مٹی کا چھینٹا اُڑا۔ ولسن کا نشانہ بھی بے کار گیا۔ اور دھول کا ایک بادل سا اُٹھا۔ ولسن نے پکار کر کہا، "ادھر آؤ۔ وہ زد سے باہر ہو گیا ہے"

اور پھر اسے بازو سے پکڑ کر کھینچ لیا۔ میکومبر اور ولسن کار کے دونوں طرف پائیدان پر کھڑے ناہموار زمین کی وجہ سے ہچکولے کھا رہے تھے، اور بھینسا اسی رفتار سے اچھلتا، اپنے موٹاپے کو سنبھالے سیدھا بھاگتا جا رہا تھا۔

کار اس کے تعاقب میں تھی۔ میکومبر گولیاں بھر رہا تھا۔ اور گھبراہٹ میں گرا رہا تھا۔ اس کی رائفل جام ہو گئی، پھر درست ہوئی۔ اتنے میں وہ بھینسے کے قریب پہنچ گئے۔ ولسن چلایا "ٹھہرو"، گاڑی پھسلتی ہوئی یک دم رکی۔ میکومبر آگے کو پاؤں کے بل گرا، اور کھٹکا چڑھا کر بندوق داغ دی۔ پھر ایک اور، پھر ایک اور، لیکن ساری گولیاں لگنے کے باوجود بھینسا بھاگتا ہی چلا گیا۔ پھر ولسن کی رائفل گرجی اور بھینسا ڈگمگایا۔ میکومبر نے بھی ٹھیک سے نشست لے کر ایک اور گولی ماری اور بھینسا گھٹنوں کے بل گر گیا۔

"بہت خوب"، ولسن نے کہا۔ "اچھے رہے، تین گرا لیے"

میکومبر کو نشہ سا آ گیا۔

"تم نے کتنی گولیاں چلائیں؟"

"صرف تین" ولسن نے جواب دیا۔ پہلا بھینسا تم نے اکیلے مارا۔ وہ سب سے بڑا تھا۔ دوسرے دو میں، میں نے تمہاری امداد کی۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں بھاگ کر محفوظ جگہ نہ پہنچ جائیں۔ یہ بھی تمہیں نے مارے ہیں۔ اور خوب نشانے کیے۔

"چلو کار میں چلیں، مجھے بھوک لگ رہی ہے"

"پہلے اس بھینسے کو ختم کر لیں"، ولسن نے اس سے کہا۔ بھینسا ابھی گھٹنوں کے بل کھڑا زور زور سے اپنا سر ہلا رہا تھا۔ جب وہ نزدیک آئے تو اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں نکال کر بڑے غصے سے پھنکارنے لگا۔

"خیال رکھنا کہیں اٹھ کر جھپٹ نہ پڑے۔ ذرا ایک طرف کو ہٹ کر کانوں کے نزدیک اس کی گردن کا نشانہ لو۔"

میکومبر نے بڑی احتیاط سے اس موٹی، غصے سے ہلتی ہوئی گردن کے عین درمیان میں گولی ماری۔ گولی کھاتے ہی اس کا سر ڈھلک گیا۔

"بس ختم ہو گیا"، ولسن نے کہا۔ "گولی ریڑھ کی ہڈی میں لگی ہے۔ کتنے خوبصورت جانور ہیں، ہیں کہ نہیں؟"

"آؤ اب کچھ پی لیں"، میکومبر نے پھر کہا۔ ساری عمر اسے اتنا لطف کبھی نہ آیا تھا۔

کار میں میکومبر کی بیوی بیٹھی تھی اور اس کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔ "پیارے تم نے تو کمال کر دکھایا۔ یہ سواری بھی خوب تھی۔"

"ناہموار زمین پر کار دوڑانے سے تمہیں تکلیف تو نہیں ہوئی؟" ولسن نے پوچھا۔

"عجیب وحشتناک تھی یہ دوڑ، مجھے ساری عمر میں اتنی وحشت نہ ہوئی تھی!"

"آؤ سب مل کر پئیں!" میکومبر نے کہا۔

"بڑی خوشی سے"، ولسن نے کہا۔ "پہلے میم صاحب کو دو۔" اس نے بوتل میں سے خالص وسکی کے گھونٹ بھرے اور نگلتے ہوئے اسے کپکپی آ گئی۔ اس نے بوتل میکومبر کے ہاتھ میں دے دی۔ جس نے ولسن کو پکڑا دی۔

"بڑا ہی وحشتناک تھا یہ شکار"، وہ بولی، "مجھے تو شدید درد سر شروع ہو گیا ہے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ تم کار میں بیٹھ کر بھی گولیاں چلا سکتے ہو۔"

"کار میں بیٹھ کر تو کسی نے گولی نہیں چلائی۔"

"میرا مطلب کار میں بیٹھ کر تعاقب کرنے سے ہے۔"

"ہم عموماً تو ایسا نہیں کرتے،" ولسن نے جواب دیا۔ "لیکن شکار کے دوران میں کوئی قباحت بھی نظر نہ آئی۔ سارا میدان گڑھوں اور کئی قسم کی رکاوٹوں سے اٹا پڑا ہے۔ اس میں پیدل چلنے کے بجائے کار میں تعاقب کرتے ہوئے ہمارے لیے بھی کافی خطرہ تھا۔ اور اس کے علاوہ بھینسا ہر وقت ہم پر حملہ کر سکتا تھا۔ ہم نے تم سے ہر موقع دیا۔ لیکن یہ خلافِ قانون ضرور ہے۔ اگر یہ پوچھنے سے تمہارا یہی مطلب ہے؟"

"مجھے تو یہ بڑی بے انصافی معلوم ہوتی تھی، کہ ان بھاری بھرکم جانوروں کا تعاقب موٹر کار میں بیٹھ کر کیا جائے۔"

"کیا واقعی؟" ولسن نے کہا۔

"اگر نیروبی میں اس کی اطلاع ہو جائے تو کیا ہو؟"

"سب سے پہلے تو یہ ہو کہ میرا لائسنس ضبط ہو جائے۔ اور اس کے علاوہ کچھ اور ناخوشگوار باتیں بھی ہوں۔" ولسن نے بوتل سے شراب کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ "میرے کاروبار کا خاتمہ ہو جائے۔"

"سچ مچ؟"

"ہاں سچ مچ۔"

"دیکھا،" فرانسس۔ ولن نے پہلی دفعہ مسکرایا۔ اور بولا "اب اسے تمہارے خلاف بھی ایک بات ہاتھ آ گئی ہے۔"

"فرانسس۔ تمہیں میری باتوں کا مطلب نکالنے میں خوب ملکہ ہو گیا ہے۔" مارگریٹ نے کہا۔ ولسن نے دونوں کی طرف دیکھا۔ وہ سوچ رہا تھا، کہ اگر کوئی بے وقوف مرد کسی بیوقوف تر عورت سے شادی کرے تو ان کے بچوں کا عقلمندی میں کیا درجہ ہو گا۔ پھر بولا۔ ہمارا ایک بندوق بردار کار میں سے گر

گیا تھا۔ تمہیں معلوم ہوا تھا کہ نہیں ؟"

"خدایا۔ کیسے گرا۔ مجھے تو معلوم نہیں ہوا" میکومبر نے کہا۔

"وہ سامنے چلا آ رہا ہے، ویسے تو ٹھیک ٹھاک ہے۔ یہ اس وقت گیا ہوگا جب ہم نے پہلے بھینسے کو مارا۔"

ادھیڑ عمر کا بندوق بردار لنگڑاتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ اس کے سر پہ پہنی ہوئی ٹوپی تھی۔ خاکی قمیص اور نکر، اور پاؤں میں ربڑ کا سلیپر۔ چہرے سے اداسی اور بیزاری کا اظہار ہوتا تھا۔ نزدیک پہنچ کر اس نے سواحیلی زبان میں کچھ کہا۔ جسے سُن کر ولسن کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

"کیا کہتا ہے ؟" مارگریٹ نے پوچھا۔

"کہتا ہے کہ پہلا بھینسا اٹھ کھڑا ہو گیا اور جھاڑیوں میں چلا گیا" ولسن کے الفاظ سے کسی جذبے کا اظہار نہ ہوتا تھا۔

"اوہ" میکومبر کے منہ سے صرف اتنا ہی نکلا۔

"اب وہی بات ہو گی جو شیر کے شکار میں ہوئی تھی" مارگریٹ نے بڑے وثوق کے ساتھ اپنی توقع کا اظہار کیا۔

"شیر کے شکار والی کوئی بات نہ ہو گی" ولسن نے کہا "میکومبر تھوڑی سی اور شراب پیو گے ؟"

"ہاں پیوں گا۔ شکریہ!" میکومبر نے کہا۔ اسے یہی خیال تھا کہ شیر والا خوف و ہراس اس پر طاری ہو جائے گا۔ لیکن اس کا شائبہ تک موجود نہ تھا، زندگی میں آج پہلا موقع تھا کہ وہ اپنے آپ کو بے خوف اور نڈر محسوس کر رہا تھا۔ خوف کے بجائے اس کی طبیعت میں فرحت و انبساط پیدا ہو رہا تھا۔

"آؤ، دوسرے بھینسے کو ذرا ایک نظر دیکھ آئیں" ولسن نے کہا "میں

ڈرائیور سے کہتا ہوں کہ کار کو سائے میں کھڑا کر دے۔"

"اب کیا کرنا چاہتے ہو؟" مارگریٹ نے پوچھا۔

"بھینسے کو ایک نظر دیکھ لیں۔"

"میں بھی آؤں گی۔"

"چلی آؤ۔"

تینوں مل کر اُس جگہ پہنچے جہاں بھینسے کا سیاہ فام جسم کھلی جگہ میں پڑا تھا۔ اس کا سر گھاس پر پڑا تھا اور لمبے سینگ دونوں طرف پھیلے ہوئے تھے۔

"بڑا عمدہ سر ہے" ولسن نے کہا۔ "سینگوں کا فاصلہ پچاس انچ کے قریب ہے۔"

میکومبر اسے دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔

"کتنا ناگوار نظارہ ہے" مارگریٹ نے کہا۔ "کہیں سائے میں نہ چلیں؟"

"ہاں ہاں، سائے میں چلو،" ولسن نے کہا "اُدھر دیکھو" ولسن نے میکومبر کو اشارے سے بتایا۔ "وہ جھاڑیوں کا قطعہ دیکھتے ہو؟"

"ہاں"

"وہ پہلا بھینسا انہی جھاڑیوں میں گھسا ہے۔ بندوق بردار کہتا ہے کہ جب وہ گرا ہے تو بھینسا چت پڑا تھا۔ وہ ہمیں دوسرے دو بھینسوں کے تعاقب میں بھاگتے ہوئے دیکھ رہا تھا جب اس نے دوبارہ نظر کی تو بھینسا کھڑا تھا اور اس کی طرف تاک رہا تھا۔ بندوق بردار سر پٹ بھاگا اور بھینسا آہستہ آہستہ چلتا ہوا جھاڑیوں میں داخل ہو گیا۔"

"کیا اب ہم اس کی تلاش میں چلیں؟" میکومبر نے بڑی خواہش سے کہا۔

ولسن نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اُس نے سوچا کہ عجیب قسم کا آدمی

سے ہے۔" کل تک تو یہ خوف دہراس سے مرا جاتا تھا، اور آج یہ ہر خطرے کو مول لینے پر تیار ہے۔

"تھوڑی دیر اور انتظار کر لو۔"

"خدا کے لیے کہیں سائے میں چلو۔" مارگریٹ نے پھر کہا۔ اس کا چہرہ سفید ہو رہا تھا اور وہ ایسے دکھائی دے رہی تھی، جیسے بڑی تکلیف میں ہو۔

وہ کار کی طرف گیے جو ایک تنہا درخت کے گھنے سائے میں کھڑی تھی! وہ سب کے سب اس میں بیٹھ گئے۔

"میرا خیال ہے کہ وہ اب تک مر چکا ہو گا۔" ولسن نے کہا "تھوڑی دیر بعد ہم چل کر دیکھیں گے۔"

میکومبر خوشی سے دیوانہ ہو رہا تھا، اسے اتنی مسرت کبھی نہ ہوئی تھی۔

"خدا کی قسم اس کے تعاقب میں بڑا ہی لطف آیا۔ کتنا مزہ آیا مارگریٹ؟"

"خاک بھی نہیں، مجھے تو نفرت ہوتی تھی۔" اُس نے غصے سے کہا "گھن آتی تھی۔"

"میرا خیال ہے کہ اب میں کبھی کسی چیز سے خوف نہیں کھاؤں گا۔" میکومبر نے ولسن سے کہا۔ "جب میں نے پہلے پہل بھینسے کو دیکھا، اور ہم اس کے تعاقب میں روانہ ہوئے، تو مجھے اپنے آپ میں ایک خاص تبدیلی محسوس ہوئی۔ ایسے جیسے کوئی پانی کا ذخیرہ پھٹ پڑتا ہے اور میری طبیعت میں جوش بھر گیا۔"

"اپنے دل و جگر کو خوف کے احساس سے پاک کر لو۔" ولسن نے کہا۔

"شکار میں لوگوں پر بڑی عجیب و غریب کیفیات کا احساس ہوتا ہے۔"

میکومبر کا چہرہ جوش مسرت سے چمک رہا تھا "واقعی کوئی عجیب و غریب تبدیلی ہوئی ہے۔ میں اپنے آپ کو بالکل بدلا ہوا محسوس کرتا ہوں۔"

اس کی بیوی نے کوئی بات نہ کی اور اس کی طرف بڑی عجیب نظروں سے تکتی رہی۔ وہ اپنی نشست پر پیچھے ہٹی ہوئی ٹیک لگائے بیٹھی تھی، اور میکومبر آگے بڑھ کر ولسن سے باتیں کر رہا تھا جو اگلی نشست پر پیچھے کی طرف رخ کئے بیٹھا تھا۔

"ولسن! میں ایک اور شیر سے نبرد آزما ہونا چاہتا ہوں۔ میں اب ان سے بالکل نہیں ڈرتا۔ آخر وہ میرا بگاڑ بھی کیا سکتے ہیں!"

"خوب کہا میکومبر! زیادہ سے زیادہ یہی نا کہ وہ تمہیں مار ڈالے گا۔ شیکسپئر نے خوب کہا ہے۔ دیکھو شاید مجھے یاد آجائے۔ بڑا ہی عمدہ قول ہے۔ میں خود اسے اپنے آپ پر اطلاق کیا کرتا تھا۔ ہاں، یاد آگیا، "قسمیہ کہتا ہوں کہ مجھے اس کی پرواہ ہی نہیں ہے۔ انسان صرف ایک دفعہ مرتا ہے۔ ہمیں خدا کو ایک ہی دفعہ جان دینی ہے۔ چاہے وہ کسی طرح نکلے۔ اس سال جو مر جاتا ہے وہ اگلے سال کے لیے سرخرو ہو جاتا ہے۔ کتنا عمدہ قول ہے۔"

یہ قول بیان کر کے، جس کے مطابق اس نے اپنی زندگی لبسر کی تھی اُسے بڑی الجھن ہوتی۔ لیکن اس نے ایسے لوگ بھی دیکھے تھے، جو اس پیشے میں زندگی گزار کر بھی عمر طبیعی کو پہنچ گئے تھے۔ وہ ان سے کافی متاثر ہوا تھا۔ اُن کی شجاعت کوئی نوجوانی کے جوش کی وجہ سے تو نہ تھی۔

لیکن میکومبر کے معاملے میں شکار کا یہ عجیب اتفاق پیش آیا جس میں اسے فکر اور تامل کی فرصت ہی نہ ملی۔ یہ اتفاق چاہے جس طرح بھی پیش آیا ہو اس شخص میں تبدیلی ضرور ہو گئی ہے۔ اب اس شکاری کو دیکھو۔ ولسن نے سوچا، میرے خیال میں بعض لوگ بڑی دیر تک بچے ہی رہتے ہیں ——— اور بعض ساری عمر بچے بنے رہتے ہیں ——— پچاس سال کی عمر

ہے۔" کل تک تو یہ خوف دہراس سے مرا جاتا تھا، اور آج یہ ہر خطرے کو جھیل لینے پر تیار ہے۔

"تھوڑی دیر اور انتظار کر لو۔"

"خدا کے لیے کہیں سائے میں چلو۔" مارگریٹ نے پھر کہا۔ اس کا چہرہ سفید ہو رہا تھا اور وہ ایسے دکھائی دے رہی تھی، جیسے بڑی تکلیف میں ہو۔

وہ کار کی طرف گئے جو ایک تنہا درخت کے گھنے سائے میں کھڑی تھی اور سب کے سب اس میں بیٹھ گئے۔

"میرا خیال ہے کہ وہ اب تک مر چکا ہو گا۔" ولسن نے کہا "تھوڑی دیر بعد ہم چل کر دیکھیں گے۔"

میکومبر خوشی سے دیوانہ ہو رہا تھا، اسے اتنی مسرت کبھی نہ ہوئی تھی۔

"خدا کی قسم اس کے تعاقب میں بڑا ہی لطف آیا۔ کتنا مزہ آیا مارگریٹ؟"

"خاک بھی نہیں، مجھے تو نفرت ہوتی تھی۔" اُس نے غصے سے کہا "گھن آتی تھی۔"

"میرا خیال ہے کہ اب میں کبھی کسی چیز سے خوف نہیں کھاؤں گا۔" میکومبر نے ولسن سے کہا۔ "جب میں نے پہلے پہل بھینسے کو دیکھا، اور ہم اس کے تعاقب میں روانہ ہوئے، تو مجھے اپنے آپ میں ایک خاص تبدیلی محسوس ہوئی ایسے جیسے کوئی پانی کا ذخیرہ پھٹ پڑتا ہے اور میری طبیعت میں جوش بھر گیا۔"

"اپنے دل و جگر کو خوف کے احساس سے پاک کر لو۔" ولسن نے کہا۔ "شکار میں لوگوں پر بڑی عجیب و غریب کیفیات کا احساس ہوتا ہے۔"

میکومبر کا چہرہ جوش مسرت سے چمک رہا تھا۔ "واقعی کوئی عجیب و غریب تبدیلی ہوئی ہے۔ میں اپنے آپ کو بالکل بدلا ہوا محسوس کرتا ہوں۔"

اس کی بیوی نے کوئی بات نہ کی اور اس کی طرف بڑی عجیب نظروں سے تکتی رہی۔ وہ اپنی نشست پر پیچھے ہٹی ہوئی ٹیک لگائے بیٹھی تھی، اور میکومبر آگے بڑھ کر ولسن سے باتیں کر رہا تھا جو اگلی نشست پر پیچھے کی طرف رُخ کئے بیٹھا تھا۔

"ولسن! میں ایک اور شیر سے نبرد آزما ہونا چاہتا ہوں۔ میں اب ان سے بالکل نہیں ڈرتا۔ آخر وہ میرا بگاڑ بھی کیا سکتے ہیں؟"

"خوب کہا میکومبر! زیادہ سے زیادہ یہی نا کہ وہ تمہیں مار ڈالے گا شیکسپئر نے خوب کہا ہے۔ دیکھو شاید مجھے یاد آجائے۔ بڑا ہی عمدہ قول ہے۔ میں خود اُسے اپنے آپ پر اطلاق کیا کرتا تھا۔ ہاں، یاد آگیا، "قسمیہ کہتا ہوں کہ مجھے اس کی پرواہی نہیں ہے۔ انسان صرف ایک دفعہ مرتا ہے۔ ہمیں خدا کو ایک ہی دفعہ جان دینی ہے۔ چاہے وہ کسی طرح نکلے۔ اس سال جو مر جاتا ہے وہ اگلے سال کے لیے سرخرو ہو جاتا ہے۔ کتنا عمدہ قول ہے۔"

یہ قول بیان کر کے، جس کے مطابق اس نے اپنی زندگی بسر کی تھی اُسے بڑی الجھن ہوتی۔ لیکن اس نے ایسے لوگ بھی دیکھے تھے، جو اس پیشے میں زندگی گزار کر بھی عمر طبعی کو پہنچ گئے تھے، وہ ان سے کافی متاثر ہوا تھا۔ اُن کی شجاعت کوئی نوجوانی کے جوش کی وجہ سے تو نہ تھی۔

لیکن میکومبر کے معاملے میں شکار کا یہ عجیب اتفاق پیش کار آیا جس میں اسے فکر اور تامل کی فرصت ہی نہ ملی۔ یہ اتفاق چاہے جس طرح بھی پیش آیا ہو اس شخص میں تبدیلی ضرور ہو گئی ہے۔ اب اس شکاری کو دیکھو۔ ولسن نے سوچا، میرے خیال میں بعض لوگ بڑی دیر تک بچے ہی رہتے ہیں —— اور بعض ساری عمر بچہ بنے رہتے ہیں —— پچاس سال کی عمر

میں بھی ان کا جسم بچوں کا سا ہی رہتا ہے۔ امریکہ کے یہ شاندار بچے عجیب و غریب انسان ہیں۔ لیکن میکومبر سے اب مجھے کچھ اُنس ہو چلا ہے۔ کمبخت نرالی قسم کا آدمی ہے۔ اب اس کی بے عزتی کا بھی شاید خاتمہ ہو جائے گا۔ بڑی عمدہ بات ہے۔ شاید یہ ساری عمر ڈرتا ہی رہا ہے۔ معلوم نہیں اس کی ابتدا کیسے ہوئی ہو گی۔ لیکن بہرحال اب اس کا خوف جاتا رہا ہے۔ اسے غالباً بھینسے سے ڈرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ اور ساتھ ہی غیض و غضب سے بھرا ہوا بھی تھا۔ شاید یہ بھی اس کے لیے مفید ہی رہا۔ موٹر کار کی موجودگی سے بھی اسے مدد ملی ہو گی کیونکہ یہ ایک آشنا سی چیز تھی۔ اب یہ ہر خطرے میں کودنے کے لائق ہو گیا ہے۔ جنگ میں بھی میں نے یہی کچھ ہوتے دیکھا ہے۔ خوف دُور ہو جاتا ہے اور اس کی بجائے کوئی اور چیز پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی چیز مرد کا سرمایہ ہے۔ یہ بھی اب مرد بن گیا ہے۔ عورتیں بھی اس بات کو جانتی ہیں۔ اب کوئی فکر کی بات نہیں۔

مارگریٹ کونے میں بیٹھی ہوئی ان دونوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ولسن میں کوئی تبدیلی نظر نہ آتی تھی۔ اُسے ولسن اب بھی ویسا ہی نظر آ رہا تھا جیسا کل تھا۔ جب اس نے پہلے پہل اس کے قابل تعریف اوصاف دیکھے تھے لیکن اسے اب فرانسس میکومبر میں تبدیلی نظر آ رہی تھی۔

"کیا تمہیں بھی آئندہ اقدام کے لیے میری ہی طرح مسرت محسوس ہو رہی ہے؟" میکومبر نے اپنی نئی دولت کا اندازہ کرنے کے لیے پوچھا۔

"اس کا چرچا نہ کرنا چاہیے"، ولسن نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا "بلکہ اپنے خوف کا ذکر کرنا زیادہ مناسب ہے۔ اور یاد رکھو ابھی خوف کے کئی موقعے آنے والے ہیں"

"لیکن تمہیں آئندہ اقدام کے متعلق میری طرح مسرت کا احساس ہے نا؟"

"ہاں ہے، لیکن اس سارے معاملے کے متعلق زیادہ باتیں کرنا درست نہیں، اگر کسی معاملے کے متعلق بہت زیادہ گفت گو کی جائے تو پھر حقیقی لطف زائل ہو جاتا ہے۔"

"تم دونوں محض بیہودہ باتیں کر رہے ہو" مارگریٹ نے کہا۔ موٹر میں بیٹھ کر چند بیکس اور بے زبان جانوروں کا پیچھا کرنے کے سوائے تم نے کیا ہی کیا ہے۔ اور باتیں یوں کر رہے ہو جیسے تم نے کوئی بڑا معرکہ مارا ہے۔"

"معاف کرنا، میں نے واقعی بے ضرورت باتیں کی ہیں،" یہ تو پہلے ہی بھری پڑی ہے، ولسن نے خیال کیا۔

"تمہیں معلوم ہی نہیں کہ ہم کیا باتیں کر رہے ہیں۔ تم اس میں دخل ہی کیوں دیتی ہو؟" میکومبر نے اپنی بیوی سے کہا۔

"میں جانتی ہوں تم اب بڑے بہادر بن گئے ہو۔ اور وہاں ایک دم۔" اس کی بیوی نے حقارت آمیز لہجے میں کہا۔ لیکن اس کی حقارت میں زور نہ تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے دل پر کسی چیز کا خوف چھایا ہوا ہے۔

میکومبر قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ بالکل فطری ہنسی "تم جانتی ہو۔ میں بہادر بن گیا ہوں۔ سچ سچ بہادر بن گیا ہوں۔"

"یہ بہادری اب بعد از وقت نہیں ہے۔؟" مارگریٹ نے تلخ لہجے میں کہا۔ کیونکہ پچھلے چند سالوں میں اس نے اپنی بہترین کوششیں صرف کر ڈالی تھیں۔ اور وہ اگر اب بھی اکٹھے تھے تو اس میں کسی کا قصور نہیں تھا۔

"میرے لیے تو لجدا زوقت نہیں ہے،" ہیکو میر نے جواب دیا۔
مارگریٹ اپنی نشست کے کونے میں بیٹھی رہی اور اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

"کیا خیال ہے، اب تو ہم اسے کافی وقت دے چکے ہیں؟" میکومبر نے پُرمسرت انداز میں ولسن سے کہا۔

"ہاں چلو، تمہارے پاس کچھ کارتوس بچے ہوئے ہیں؟"

"ہاں بندوق بردار کے پاس ہیں۔"

ولسن نے سواحیلی زبان میں بوڑھے بندوق بردار سے کچھ کہا۔ جو ایک بھینسے کی کھال اُتار رہا تھا۔ اس نے اُٹھ کر سیدھی کی اور کارتوسوں کا ڈبہ نکال کر میکومبر کے حوالے کر دیا۔ میکومبر نے کچھ تو رائفل میں بھر لیے اور باقی جیب میں ڈال لیے۔

"تم سپرنگ فیلڈ ہی چلانا۔ تمہیں اس کی عادت بھی ہے،" ولسن نے کہا۔ "دوسری رائفل ہم یہیں میم صاحب کے پاس چھوڑ جائیں گے۔ تمہارا بندوق بردار تمہاری بھاری بندوق اُٹھا لے گا۔ میرے پاس تو یہ توپ موجود ہی ہے۔ اب ذرا ان کے متعلق یہ بھی سُن لو،" یہ بات اس نے آخیر وقت یہ کہنے کے لیے اٹھا رکھی تھی، کیونکہ وہ میم صاحب کو پریشان نہ کرنا چاہتا تھا۔ "جب بھینسا حملہ کرتا ہے تو وہ سر اُونچا اٹھا کر اور آگے کو بڑھاتے ہوئے حملہ آور ہوتا ہے۔ دماغ کا نشانہ لیا جائے تو اس کے سینگوں کا اُبھار ڈھال کا کام دیتا ہے۔ اس لیے بہترین نشانہ یہ ہوتا ہے کہ سیدھی اس کی ناک میں گولی ماری جائے۔ اس کے علاوہ صرف ایک اور نشانہ ہے اور وہ اس کی چھاتی کا ہے۔ یا اگر تم ذرا ہٹ کر کھڑے ہوتے ہو تو پھر گردن یا

کندھے کا بھینسا جب ایک دفعہ زخمی ہو جائے تو اُسے مارنے کے لیے بڑے جتن کرنے پڑتے ہیں۔ اپنی مرضی سے کوئی حرکت نہ کر بیٹھنا جو نشانہ سب سے آسان نظر آئے اس پر فوراً عمل کرنا۔ حبشیوں نے سر کی کھال تو اُتار لی ہے اب چلیں ؟"

اُس نے بندوق بردار وں کو بُلایا۔ وہ ہاتھوں کو جھاڑتے ہوئے اُٹھے۔ دو نوں میں سے بڑا کار کی پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔

"میں صرف کنگونی کو ساتھ لے جاؤں گا" ولسن نے کہا "دوسرا گدھوں کو ہٹانے کے لیے یہیں رہے۔"

جونہی کار آہستہ آہستہ میدان کو قطع کرتی ہوئی درختوں کے اُس جھنڈ کی طرف بڑھی۔ جو سُوکھے نالے کے ساتھ ساتھ سبزے کی ایک نوک سی بنا رہا تھا۔ تو میکومبر کا دل دھڑکنے لگا۔ اور اس کی زبان پھر سوکھنے لگی۔ لیکن یہ ڈر کی وجہ سے نہیں بلکہ جوش کی وجہ سے تھا۔

"یہ جگہ ہے جہاں بھینسا چھپا ہوا ہے" ولسن نے کہا۔ اور پھر سواحیلی زبان میں بندوق بردار سے بولا "خون کے نشانوں سے کھوج لگاؤ۔"

کار جھاڑیوں کے بالکل متوازی کھڑی تھی۔ میکومبر، ولسن اور بندوق بردار تینوں اُتر پڑے۔ میکومبر نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو اس کی بیوی رائفل کو پاس رکھے کھڑی تھی اور اُسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ میکومبر نے ہاتھ ہلایا۔ لیکن اُس نے جواباً کوئی حرکت نہ کی۔

سامنے کی طرف جھاڑیاں بڑی گھنی تھیں اور زمین خشک تھی۔ بندوق بردار کا پسینہ بہہ رہا تھا۔ ولسن نے اپنی ٹوپی آنکھوں پر کھینچ رکھی تھی۔ اور اس کی سُرخ گردن میکومبر سے ذرا آگے نظر آ رہی تھی۔ یکایک بندوق بردار نے

کوئی بات سواحلی زبان میں کہی اور دوڑتا ہوا آگے بڑھا۔

"وہ جھاڑیوں میں مرا پڑا ہے"، ولسن نے بتایا "شاباش"، انہوں نے خوشی سے ایک دوسرے کے ساتھ ہاتھ ملایا اور ہنسنے لگے۔ اتنے میں بندوق بردار جھاڑیوں میں سے شور مچاتا اور دوڑتا ہوا ایک طرف سے نمودار ہوا۔ اور اس کے ساتھ ہی بھینسا۔ نتھنے پھلائے اور منہ زور سے بند کئے حملہ کرتا ہوا ظاہر ہوا۔ اس کے جسم سے خون بہہ رہا تھا۔ سر آگے کو بڑھا ہوا تھا۔ سؤر کی سی چھوٹی آنکھوں سے خون ٹپک رہا تھا۔ ولسن نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر گولی چلائی۔ میکومبر نے اس کی بندوق کی خوفناک گرج میں اپنی رائفل کی آواز بھی نہ سنی۔ لیکن اسے بھینسے کے سینگوں میں سے سلیٹ کی طرح کے ٹکڑے اڑتے نظر آئے۔ اس نے نتھنوں کا نشانہ لے کر دوسری گولی ماری۔ بھینسے نے اپنے سینگوں کو جھٹکا اور ان کے ٹکڑے پھر ہوا میں منتشر ہوتے دکھائی دیئے۔ اسے اب ولسن بھی نظر نہ آیا۔ بھینسے کا پہاڑ جیسا جسم اس کے اوپر چڑھا آ رہا تھا، کہ اس نے بڑی احتیاط سے نشانہ لیتے ہوئے پھر بندوق داغی۔ اسے بھینسے کی خونی آنکھیں اور سر جھکتا ہوا نظر آیا۔ لیکن ساتھ ہی اس کے دماغ میں ایک گرم، تپتی ہوئی چوندھیا دینے والی چمک پیدا ہوئی۔ اور یہ اس کا آخری احساس تھا۔

ولسن کندھے کا نشانہ لینے کے لیے ایک طرف کو ہٹ گیا تھا لیکن میکومبر ناک کا نشانہ کرنے کے لیے چٹان کی طرح اپنی جگہ پر جم کر کھڑا رہا تھا۔ اس کا ہر نشانہ ذرا سا اونچا پڑتا رہا تھا۔ اس سے سینگوں کے پیچھے یوں اڑتے رہے جیسے کوئی سلیٹ کی بنی ہوئی چھت پر گولیاں مارے۔ اور مسز میکومبر نے کار میں بیٹھے ہوئے ۶۰۵ بور کی مانلیچر سے عین اس وقت بھینسے پر گولی چلائی تھی،

جب وہ میکومبر کو کچلا ہی چاہتا تھا۔ لیکن بجائے بھینسے کے وہ گولی میکومبر کو گردن سے دو انچ اوپر کھوپڑی میں لگی۔

فرانسس میکومبر بھینسے کی لاش سے دو گز کے فاصلے پر اوندھے منہ پڑا تھا۔ اس کی بیوی اس پر جھکی ہوئی تھی اور ولسن پاس کھڑا تھا۔

"اسے اُلٹاؤ نہیں، یونہی پڑا رہنے دو۔" ولسن نے کہا۔

عورت پاگلوں کی طرح رو رہی تھی۔

"کار میں بیٹھ جاؤ،" ولسن نے کہا۔ "رائفل کہاں ہے؟" اُس نے اپنا سر ہلایا۔ اُس کا چہرہ بگڑا ہوا تھا۔ بندوق بردار نے رائفل اُٹھالی۔

"بندوق اسی طرح پڑی رہنے دو۔" ولسن نے کہا "جاؤ عبداللہ کو بلا لاؤ، تاکہ وہ اس حادثے کی گواہی کے لیے اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لے۔"

اس نے جیب سے ایک رومال نکالا اور اُسے فرانسس میکومبر کے ملاحوں جیسے کٹے ہوئے بالوں پر پھیلا دیا۔ سر سے خون نکل نکل کر نرم زمین میں جذب ہو رہا تھا۔

ولسن سیدھا کھڑا ہو گیا اور پاس پڑے ہوئے بھینسے کی لاش کی طرف دیکھنے لگا جس کی ٹانگیں پھیلی ہوئی تھیں اور جلد میں تشنج ہو رہا تھا۔

"کمال خوبصورت بھینسا ہے۔" اُس کے جی میں خود بخود آیا۔ کم از کم پچاس انچ کے سینگ یا شاید اس سے بھی زیادہ، اس نے ڈرائیور کو بلا کر ہدایت کی کہ میکومبر کی لاش پر کمبل ڈال دے اور خود بھی یہیں کھڑا رہے۔ پھر وہ موٹر کار کی طرف بڑھا، جہاں بے چاری عورت ایک کونے میں بیٹھی رو رہی تھی۔

"خوب کارستانی کی تم نے" اس نے جذبات سے عاری آواز میں کہا۔
"وہ یوں بھی تمہیں چھوڑ ہی دیتا۔"
"خاموش" عورت نے غصے سے کہا۔
"خیر کوئی فکر نہ کرو، کچھ تکلیف تو ضرور ہوگی، لیکن میں حادثے کی چند ایسی تصاویر لے لوں گا جو مقدمے کے دوران میں بڑا کام دیں گی۔ بندوق بردادوں اور ڈرائیور کی شہادتیں بھی موجود ہیں۔ تمہیں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔"
"خاموش۔"
"بہت سے کام ابھی کرنے ہیں مجھے ابھی ایک ٹرک جھیل کی طرف بھیجنا ہوگا، تاکہ وائرلیس کے ذریعے پیغام بھیج کر ہوائی جہاز منگوایا جائے اور ہم تینوں نیروبی پہنچیں تم نے اسے زہر کیوں نہ دے دیا؟ انگلستان میں تو عورتیں یہی طریقہ اختیار کرتی ہیں۔"
"خاموش، خاموش، خاموش" عورت نے چلا کر کہا۔
ولسن نے اپنی سپاٹ نیلی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میرا اب کوئی واسطہ نہیں رہا۔ مجھے کچھ غصہ آگیا تھا، کیونکہ اب مجھے تمہارے خاوند سے اُنس ہوتا جا رہا تھا۔"
"خدا کے لیے خاموش رہو، مجھ پر رحم کرو اور خاموش ہو جاؤ۔"
"رحم کرنے کی بات تو دوسری ہے۔ بہت اچھا، اب میں نہ بولوں گا۔"

سوئٹزرلینڈ سے اظہارِ عقیدت

(حصّہ اوّل)

مانٹریو میں مسٹر وہیلر کی تصویر

اسٹیشن کا کیفے گرم اور روشن تھا۔ میزیں بار بار صاف کرتے رہنے سے رگھس کر چکدار ہو گئی تھیں اور اُن پر پھولوں کے گلدستے سجے ہوئے تھے۔ کرسیوں پر منبت کاری ہو رہی تھی۔ لیکن اُن کی نشستیں بوسیدہ اور آرام دِہ تھیں۔ دیوار پر ایک کھدی ہوئی لکڑی کا کلاک ٹک ٹک کر رہا تھا۔ کمرے کے دوسرے سرے پر بار تھا۔ باہر برف باری ہو رہی تھی۔

کلاک کے نیچے بچھی ہوئی میز پر اسٹیشن کے دو قلی بیٹھے تازہ شراب پی رہے تھے۔ ایک اور قلی اندر داخل ہُوا، اور اس نے بتایا کہ سمپلان اورینٹ ایکسپرس سینٹ ماریس کے اسٹیشن پر ایک گھنٹے کے لیے رُک گئی ہے، وہ باہر نکل گیا۔ کیفے کی خادمہ مسٹر وہیلر کے پاس آئی اور بولی۔

"ایکسپریس ایک گھنٹہ دیر سے پہنچے گی۔ میں آپ کے لیے کافی لاؤں ؟"

"ہاں، اگر وہ میری نیند خراب نہ کر دے۔"
"پھر کیا حکم ہے؟"
"تھوڑی سی لے آؤ۔" مسٹر وھیلر نے جواب دیا۔
"شکریہ"
وُہ باورچی خانے سے کافی لے آئی۔ مسٹر وہیلر نے باہر جھانک کر دیکھا۔ پلیٹ فارم کی روشنی میں برف پڑتی نظر آ رہی تھی۔
"کیا تم انگریزی کے علاوہ اور بھی کوئی زبان جانتی ہو؟" اُس نے خادمہ سے پوچھا۔
"جی ہاں، میں فرانسیسی اور جرمنی بھی بول سکتی ہوں۔"
"کیا کوئی چیز پیو گی۔؟"
"نہیں صاحب اس کیفے میں گاہکوں کے ساتھ بیٹھ کر پینے کی اجازت نہیں ہے۔"
"سگار پیو گی؟"
"نہیں صاحب، میں تمباکو پیتی ہی نہیں۔"
"بہت اچھی بات ہے،" مسٹر وہیلر نے کہا۔ اس نے کھڑکی میں سے باہر نظر ڈالی اور کافی پی کر ایک سگرٹ سلگا لیا۔
"خاتون" اس نے لڑکی کو آواز دی، وہ آ گئی۔
"آپ کو کسی اور چیز کی ضرورت ہے۔؟"
"ہاں، تمہاری" اس نے جواب دیا۔
"آپ کو میرے ساتھ یوں مذاق نہ کرنا چاہیئے۔"
"میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔"

"تو پھر ایسی بات آپ کو کہنا نہ چاہیئے۔"

"میرے پاس بحث کرنے کا وقت نہیں ہے،" مسٹر وہیلر نے کہا: "گاڑی کے آنے میں چالیس منٹ باقی ہیں۔ اگر تم میرے ساتھ اوپر چلو تو میں تمہیں سو فرانک دوں گا۔"

"آپ کو ایسی گفتگو نہ کرنی چاہیئے صاحب۔ اگر آپ باز نہ آئے تو میں ان قلیوں سے کہہ دوں گی۔"

"مجھے قلی کی ضرورت نہیں ہے" مسٹر وہیلر نے کہا "نہ پولیس کے سپاہی کی، نہ سگریٹ بیچنے والے لونڈے کی۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔"

"اگر آپ نے ایسی ہی گفتگو کرنی ہے تو یہاں سے تشریف لے جائیے۔ آپ یہاں نہیں ٹھہر سکتے۔"

"تو پھر تم ہی کیوں نہیں چلی جاتیں۔ تم چلی جاؤ گی تو میں تمہارے ساتھ باتیں بھی نہ کر سکوں گا۔"

خادمہ چلی گئی تو مسٹر وہیلر دیکھتے رہے کہ کہیں قلیوں سے تو شکایت نہیں کرتی۔ اس نے قلیوں سے بھی کچھ نہ کہا۔

"خاتون!" اس نے پھر پکارا، خادمہ پھر آ گئی "مہربانی سے شراب کی ایک بوتل لا دو۔"

"بہت بہتر صاحب"

مسٹر وہیلر اسے جاتے ہوئے اور پھر شراب لے کر آتے ہوئے دیکھتے رہے، یہاں تک کہ وہ ان کی میز پر پہنچ گئی۔ پھر انہوں نے کلاک کی طرف دیکھا

"میں تمہیں دو سو فرانک دینے کو تیار ہوں۔"

"آپ ایسی باتیں ہرگز نہ کہئے۔ سنا آپ نے۔"

"دو سو فرانک کافی رقم ہوتی ہے"

"آپ ایسی باتیں ہرگز نہ کریں" خادمہ نے کہا۔ وہ اپنی انگریزی طرز گفتگو کو بھولتی چلی جا رہی تھی۔ مسٹر وہیلر بڑی دلچسپی سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"دو سو فرانک"

"میں آپ کو ذلیل سمجھتی ہوں۔"

"تو پھر چلی کیوں نہیں جاتیں؟ اگر تم یہاں نہ ہوگی تو میں بات کس سے کروں گا۔"

خادمہ میز چھوڑ کر بار کی طرف چل گئی۔ مسٹر وہیلر شراب پیتے ہوئے آپ ہی آپ مسکراتا رہا۔

"خاتون" اس نے پھر آواز دی۔ خادمہ آگئی۔

"کسی اور چیز کی خواہش ہے؟"

"ہاں بہت زیادہ۔ میں تمہیں تین سو فرانک دوں گا۔"

"آپ بڑے ذلیل انسان ہیں۔"

"تین سو فرانک سوئٹزرلینڈ کے۔"

وہ چلی گئی اور مسٹر وہیلر اس کی طرف دیکھتے رہے۔ ایک قلی نے دروازہ کھولا۔ یہ وہی قلی تھا جو مسٹر وہیلر کا سامان اٹھا کر لایا تھا۔

"گاڑی آ رہی ہے صاحب" اس نے فرانسیسی زبان میں کہا۔ مسٹر وہیلر اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

"خاتون" انہوں نے پھر آواز دی۔ خادمہ میز کے قریب آگئی۔

"شراب کے لئے مجھے کیا دینا ہے؟"

"سات فرانک"

مسٹر ڈھیلر نے آٹھ فرانک گن کر میز پر ڈال دیئے اس نے اپنا راٹ پہنا اور قلی کے پیچھے پیچھے پلیٹ فارم پر نکل گیا جہاں ابھی تک برف پڑ رہی تھی۔

"الوداع، خاتون" اس نے آخری مرتبہ کہا۔ خادمہ اسے رخصت ہوتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اس نے دل میں کہا کتنا برا آدمی ہے۔ برا اور نفرت انگیز تین سو فرانک ایک معمولی سی بات کے لیے دے رہا تھا۔ ایسی بات کے لیے جو بارہا میں بغیر کسی معاوضہ کے کر چکی ہوں۔ اور یہاں جانے کی جگہ بھی کونسی تھی۔ نہ کوئی دقت تھا نہ جگہ۔ اتنی معمولی بات کے لیے تین سو فرانک خرچ کرنا چاہتا تھا۔ یہ امریکی بھی عجیب قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔

اور اپنے سامان کے پاس سیمنٹ کے پلیٹ فارم پر کھڑے کھڑے مسٹر ڈھیلر کبھی لائنوں کی طرف دیکھتا اور کبھی برفباری میں سے چھپن چھپ کر آتی ہوئی انجن کی روشنی کی طرف۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ دل لگی بھی بڑی سستی رہی۔ اس نے کھانے کے علاوہ شراب پر صرف سات فرانک خرچ کئے اور ایک فرانک بطور بخشیش دیا۔ اگر پورے فرانک کے بجائے پچھتر سنتائم دیتا تو زیادہ مناسب تھا۔ پچیس سنتائم اور بچ جاتے۔ سوئٹزرلینڈ کا ایک فرانک پانچ فرانسیسی فرانکوں کے برابر ہوتا ہے۔ مسٹر ڈھیلر اب پیرس جا رہا تھا۔ وہ عورت کے مقابلے میں روپے کی زیادہ پرواہ کرتا تھا۔ اس اسٹیشن پر وہ پہلے بھی اکثر آ چکا تھا۔ اور جانتا تھا کہ کیفے کے اوپر کوئی اور منزل نہیں ہے۔ وہ ہمیشہ سوچ سمجھ کر بات کرنے کا عادی تھا۔

(حصّہ دوم)

ڈیوی کے اسٹیشن پر مسٹر جانسن کے ساتھ کیا گزری

اسٹیشن کا کیفے گرم اور روشن تھا۔ میز بار بار پونچھتے رہنے سے چمکدار ہو گئے تھے۔ اور بعض پر سُرخ اور سفید دھاریوں والے میز پوش پڑے تھے، سب میزوں پر پھولوں کے گلدستے سجے ہوئے تھے۔ کرسیوں پر بیل بوٹے کھدے ہوئے تھے۔ لیکن ان کی نشستیں بوسیدہ اور آرام دہ تھیں۔ دیوار پر ایک کلاک آویزاں تھا اور کمرے کے دوسرے سرے پر بار تھا۔ کھڑکی کے باہر برف باری ہو رہی تھی۔ کلاک کے نیچے بچھی ہوئی میز پر اسٹیشن کے دو قلی بیٹھے تازہ شراب پی رہے تھے۔

ایک اور قلی اندر داخل ہوا۔ اور اس نے بتایا کہ اورین سپلان ایکسپریس، سینٹ مارلیس کے اسٹیشن پر ایک گھنٹے کے لیے رُک گئی ہے۔ خادمہ مسٹر جانسن کے پاس آئی اور بولی :-

"ایکسپریس ایک گھنٹہ دیر سے پہنچ رہی ہے۔ میں آپ کے لیے کافی لے آؤں ؟"

"اگر تمہیں تکلیف نہ ہو تو"

"کیا فرمایا آپ نے ؟"

"تھوڑی سی لے آؤ"

"شکریہ"

خادمہ باورچی خانے سے کافی لے آئی۔ مسٹر جانسن نے کھڑکی سے پلیٹ فارم کی روشنی میں بوندا باندی ہوتی ہوئی دیکھی۔

"تم انگریزی کے علاوہ کوئی اور زبان بھی بولتی ہو۔؟" اس نے خادمہ سے پوچھا۔

"ہاں جرمنی اور فرانسیسی زبانیں جانتی ہوں۔"

"کوئی شراب پینا پسند کرو گی؟"

"نہیں صاحب، کیفے میں گاہکوں کے ساتھ پینے کی اجازت نہیں ہے۔"

"سگار لو گی؟"

"نہیں صاحب، میں تمباکو نہیں پیتی۔" اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"میں خود بھی نہیں پیتا۔ بڑی گندی عادت ہے۔" جانسن نے کہا۔

خادمہ چلی گئی تو جانسن نے سگرٹ سلگایا اور کافی پی لی۔ دیوار پر کی کلاک میں پونے دس بجے تھے۔ اس کی اپنی گھڑی کسی قدر آگے تھی۔ گاڑی کو ساڑھے دس بجے پہنچنا تھا۔ اب ساڑھے گیارہ بجے پہنچے گی۔

"خاتون!"

"کیا چاہیئے صاحب؟"

"میرے ساتھ کچھ ہنسی کھیل پسند کرو گی؟" جانسن نے پوچھا۔ خادمہ کے چہرے پر حیا کی سرخی دوڑ گئی۔

"نہیں صاحب۔"

"کوئی نازیبا بات نہیں، مثلاً ہم اکٹھے ہو کر ویری کی تشبیہ زندگی دیکھنے چلیں۔ تم اپنی کسی سہیلی کو بھی ساتھ لے چلو۔"

"مجھے کام کرنا ہے،" خادمہ نے جواب دیا۔ "مجھے اپنا کار منصبی یہیں ادا

کرتا ہے"

"یہ میں جانتا ہوں" جانسن نے جواب دیا "لیکن اپنی جگہ کسی اور کو کھڑا کر جاؤ۔ خانہ جنگی کے زمانے میں اسی طرح کیا کرتے تھے"

"نہیں صاحب، مجھے ذاتی طور پر یہاں حاضر رہنا ہے"

"تم نے انگریزی کہاں سے سیکھی تھی؟"

"برلٹز سکول میں صاحب"

"اس کے متعلق کوئی بات سناؤ۔ برلٹز کے لڑکے وحشی قسم کے تو نہیں تھے۔ مثلاً گردن میں باہیں ڈالنا یا اور اسی قسم کی باتیں کرنا۔ کوئی خوشامدی قسم کے لونڈے بھی تھے۔ کبھی تمہیں سکاٹ فٹز جیرلڈ سے ملنے کا اتفاق بھی ہوا ہے؟"

"کیا مطلب صاحب؟"

"میرا مطلب ہے تمہارے کالج کے دن زندگی کے خوشگوار ترین دن تھے؟ پچھلے خزاں میں برلٹز کے طالب علم کس قسم کے تھے؟"

"آپ تو مذاق کرتے ہیں صاحب"

"ہاں لیکن برائے نام سا" مسٹر جانسن نے کہا تم بڑی ہی اچھی لڑکی ہو۔ اور تم میرے ساتھ ہنسی کھیل بھی پسند نہیں کرتیں؟"

"نہیں صاحب"، خادمہ نے کہا "آپ کوئی اور چیز منگوانا چاہتے ہیں؟"

"ہاں، مسٹر جانسن نے کہا "ذرا شراب کی فہرست تو اٹھا لاؤ"

"بہت بہتر صاحب"

جانسن شراب کی فہرست لیکر اس میز کی طرف گیا، جہاں تین قلی بیٹھے تھے۔ انہوں نے اس کی طرف دیکھا۔ تینوں ادھیڑ عمر کے تھے۔

"تم شراب پیو گے؟" جانسن نے پوچھا۔ ایک قُلی نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا، اور بولا "ہاں صاحب"

"تم فرانسیسی جانتے ہو؟"

"ہاں، صاحب"

"کون سی شراب پئیں؟" اس نے خادمہ کو آواز دی "خاتون ۔ ! ہم شمپین پئیں گے"

"کون سی شمپین آپ پسند کرتے ہیں؟"

"جو تمہارے پاس سب سے اچھی ہے" پھر قلیوں کی طرف مخاطب ہو کر بولا "کونسی سب سے اچھی ہے؟"

"میں بتاؤں صاحب؟" اس قلی نے کہا جو سب سے پہلے بولا تھا۔

"ہاں، ہاں، تم بتاؤ؟"

قلی نے اپنے کوٹ کی جیب سے سونے کی کمانیوں والی عینک نکالی اور فہرست پڑھنے لگا۔ اس نے اپنی انگلی ٹائپ کی ہوئی چار سطروں پر پھیری ۔ اور ان کی قیمتوں کو بھی دیکھا۔

"سپورٹس مین سب سے اچھی ہے" اس نے فیصلہ کیا۔

"آپ سب کو بھی اتفاق ہے؟" جانسن نے دوسرے قلیوں سے پوچھا ۔ ایک نے اپنا سر ہلا دیا۔ دوسرے نے فرانسیسی میں کہا "میں نے انہیں پیا تو نہیں، لیکن اس کی تعریف بہت سنی ہے ۔ سپورٹس مین سب سے اچھی ہے"

"تو سپورٹس مین کی ایک بوتل لے آؤ" جانسن نے خادمہ سے کہا۔ اس نے فہرست پر سے قیمت دیکھی۔ جو سوئٹزرلینڈ کے گیارہ فرانک تھی۔

اچھا دو بوتلیں لاؤ۔ اگر میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ بیٹھوں تو آپ بُرا تو نہ مانیں گے۔؟" جانسن نے اس قلی سے کہا جس نے سیوریٹس مین تجویز کی تھی۔

"تشریف رکھیئے صاحب، ہم بُرا کیوں مانیں گے۔" قلی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر اپنی عینک کو تہہ کر کے جیب میں رکھ لیا۔ "کیا آج آپ کی سالگرہ ہے؟"

"نہیں تو،" جانسن نے کہا "یہ جلسہ خوشی کا نہیں ہے، بات یہ ہے، کہ میری بیوی نے مجھے طلاق دے دی ہے۔"

"یہ بات ہے" قلی نے کہا۔ "نہیں صاحب یہ بات نہ ہو گی" دوسرے قلی نے سر ہلاتے ہوئے کہا، تیسرا نہ بولا، وہ شاید بہرا تھا۔

"یہ ایک عام سی بات ہو گئی ہے" جانسن نے کہا، "میرے لیے یہ تجربہ بالکل اسی طرح کا ہے، جیسے کوئی شخص پہلی دفعہ دندان ساز کے پاس جائے، یا جیسے پہلی دفعہ کسی کی معشوقہ بیمار ہو جائے۔ لیکن میری طبیعت کچھ منغص ضرور ہو گئی ہے۔"

"میں سمجھتا ہوں۔" سب سے بڑی عمر کے قلی نے کہا "میں سمجھتا ہوں۔"

"تم میں سے کسی صاحب کو طلاق تو نہیں ملی۔؟" جانسن نے پوچھا۔ اب اس نے دوسری زبانیں چھوڑ کر صاف فرانسیسی میں بات چیت شروع کر دی تھی۔

"نہیں" اس قلی نے کہا، جس نے سیوریٹس مین تجویز کی تھی "یہاں طلاق کا عام رواج نہیں ہے۔ ایسے لوگ ہیں تو ضرور لیکن بہت کم۔"

"ہمارے ہاں معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ قریب قریب ہر آدمی طلاق یافتہ ہے۔" جانسن نے بتایا۔

"یہ ٹھیک ہے" قلی نے تصدیق کی۔ "میں نے بھی اخبار میں پڑھا تھا۔"

"عام لوگوں سے تو میں اب بھی پھسڈی ہی ہوں" جانسن نے کہا "مجھے ابھی پہلی دفعہ طلاق ملی ہے۔ اور میری عمر پینتیس سال ہے۔"

"ابھی تو صاحب بالکل جوان ہیں" ایک قلی نے کہا۔

"اور کیا آپ کو واقعی پہلی دفعہ طلاق ملی ہے؟" دوسرے نے پوچھا۔

"بالکل یہی بات ہے" جانسن نے کہا۔ "خاتون بوتل کھولئے"

"تو کیا طلاق بہت مہنگی پڑتی ہے؟"

"دس ہزار فرانک دینے پڑے"

"سوئٹزرلینڈ کے دس ہزار"

"نہیں، فرانسیسی"

"ہاں، تو پھر بھی یہاں کے دو ہزار ہوئے۔ کوئی سستا کام تو نہیں"

"نہیں"

"لیکن یہ طلاق دی کیوں جاتی ہے؟"

"طلاق دی نہیں جاتی بلکہ لی جاتی ہے"

"لیکن وہ طلاق لیتی ہی کیوں ہیں؟"

"دوسری جگہ شادی کرنے کے لیے"

"لیکن یہ تو بڑی احمقانہ بات ہے"

"تمہارا خیال درست ہے" جانسن نے کہا۔ خادمہ نے چاروں گلاس بھر دیئے۔ سب نے ہاتھوں میں اٹھا لیے۔

ایک نے جرمن میں، دوسرے نے فرانسیسی میں، اور تیسرے نے سوئٹزرلینڈ کی زبان میں جام صحت تجویز کیا۔ شمپئن کا مزہ سیب کی میٹھی شراب

کی طرح تھا۔

"کیا یہ سوئٹزرلینڈ کا رواج ہے کہ ہر شخص الگ زبان میں جام صحت تجویز کرے ؟"

"نہیں تو" قلی نے کہا۔ "اصل میں فرانسیسی سب سے زیادہ شستہ زبان ہے ۔"

"لیکن تم تو جرمنی بولتے ہو؟"

"یہ صحیح ہے ۔ کیونکہ جس علاقے کا میں رہنے والا ہوں وہاں جرمن ہی رائج ہے ۔"

"اب سمجھ گیا" جانسن نے کہا ۔ "اور تم کہتے ہو کہ تمہیں کبھی طلاق نہیں ملی ۔؟"

"نہیں صاحب ، یہ تو بڑی مہنگی شے ہے ، اور اس کے علاوہ میں نے تو شادی بھی نہیں کی ۔"

"خوب ، اور یہ باقی دو اصحاب ؟"

"یہ شادی شدہ ہیں"

"تمہیں شادی پسند ہے ؟"

"کیا مطلب ؟"

"میرا مطلب ہے ، تمہیں شادی شدہ زندگی پسند ہے ؟"

"ہاں صاحب ، بظاہر تو پسند ہی ہے ۔"

"ٹھیک ہے ۔ اور آپ کو صاحب ؟" اُس نے دوسرے سے پوچھا۔

"ہماری بھی نہیتی جا رہی ہے" دوسرے نے جواب دیا ۔

"حیرت کی بات ہے ،" جانسن نے کہا ۔

"صاحب، طلاق دے رہے ہیں" پہلے قلی نے دوسرے کو سمجھایا۔
"اوہ" دوسرے قلی نے کہا۔
"اہا" تیسرا قلی بولا۔
"اچھا" جانسن نے کہا۔ معلوم ہوتا ہے یہ موضوع ختم ہو گیا ہے، آپ لوگوں کو میرے مصائب میں کوئی دلچسپی نہیں ہے" اس نے پہلے قلی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
"ہمدردی کیوں نہیں صاحب!" قلی نے کہا۔
"اچھا تو آؤ، کوئی اور بات کریں"
"جیسی آپ کی مرضی"
"کیا بات کریں؟"
"آپ کھلاڑی ہیں صاحب؟"
"نہیں" جانسن نے کہا۔ "میری بیوی ہے"
"تو آپ کا کیا شغل ہے"؟
"میں مصنف ہوں"
"کیا اس میں بہت زیادہ کمائی ہے؟"
"ابھی تو نہیں، لیکن جب آدمی مشہور ہو جائے، تو کافی آمدنی ہوتی ہے"
"بڑی دلچسپ بات ہے"
"دلچسپ تو خاک بھی نہیں" جانسن نے کہا "مجھے افسوس ہے صاحبو! اب میں آپ سے اجازت لیتا ہوں، آپ دوسری بوتل خود ہی پی لیں"
"لیکن گاڑی کے آنے میں تو ابھی پون گھنٹہ باقی ہے"
"مجھے معلوم ہے" خادمہ آئی تو اس نے کھانے اور شراب کے دام

چپکا دیئے۔

"آپ باہر جا رہے ہیں صاحب"؟

"ہاں ذرا باہر گھوموں گا۔" "میرا سامان یہیں پڑا ہے۔"

اس نے اپنا گلوبند، کوٹ اور ٹوپی پہن لی۔ باہر بڑے زور کی برفباری ہو رہی تھی۔ اُس نے کھڑکی میں سے تینوں قلیوں کی طرف دیکھا۔ خادمہ کھلی ہوئی بوتل میں سے باقی شراب اُن کے گلاسوں میں انڈیل رہی تھی۔ بند بوتل کو وہ واپس بار میں لے گئی۔ جانسن نے سوچا، ان میں سے ہر ایک کو تین فرانک اور کچھ ریزگاری مل جائے گی۔ وہ مڑا، اور پلیٹ فارم کے ایک طرف چل دیا۔ کیفے کے اندر وہ سوچ رہا تھا کہ طلاق کے متعلق باتیں کرنے سے کچھ جی ہلکا ہو جائے گا۔ لیکن ہلکا ہونے کے بجائے اس کی طبیعت اور بوجھل ہو گئی۔

(حصہ سوم)

ٹیری ٹرٹ کے اسٹیشن پر ایک ہم مذاق کے بیٹے سے ملاقات

ٹیری ٹرٹ کے اسٹیشن پر کیفے میں خوب گرمی تھی، بجلی کے قمقمے روشن تھے، اور میزوں کا روغن چمک رہا تھا، میزوں پر پھولوں کے گلدستے سجے تھے۔ اور بیئر کے گلاس رکھنے کے لیے گتے کے ٹکڑے پڑے تھے۔ تاکہ گیلے گلاسوں کی وجہ سے گول گول داغ نہ پڑ جائیں۔ کرسیوں پر بیل بوٹوں کی کھدائی ہو رہی تھی۔ لیکن ان کی نشستیں بوسیدہ اور آرام دہ تھیں۔ دیوار پر ایک کلاک آویزاں تھا۔ کمرے کے دوسرے سرے پر بار تھا اور دروازے سے باہر برفباری ہو رہی تھی۔ کلاک کے نیچے بچھے ہوئے میز پر ایک بوڑھا آدمی بیٹھا کافی پی رہا تھا اور شبینہ اخبار کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اتنے میں ایک قلی داخل ہوا۔ اور اس نے بتایا کہ سمپلان اورین ایکسپریس سینٹ ماریس اسٹیشن سے ایک گھنٹہ دیر سے روانہ ہوگی۔ خادمہ مسٹر ہیرس کی میز پر آئی جس نے ابھی ابھی کھانا ختم کیا تھا۔

"ایکسپریس ایک گھنٹہ دیر سے پہنچے گی۔ اگر آپ فرمائیں تو میں آپ کے لیے اور کافی لے آؤں؟"

"جیسی تمہاری مرضی۔"

"میں نہیں سمجھی؟" خادمہ بولی۔

"لے آؤ" مسٹر ہیرس نے کہا۔

"شکریہ صاحب"

خادمہ باورچی خانے سے کافی لے آئی، مسٹر ہیرس نے اس میں شکر ملائی، چمچے سے ٹکڑوں کو پگھلایا، اور کھڑکی سے باہر پلیٹ فارم کی روشنی میں دیکھا کہ برفباری ابھی تک ہو رہی ہے۔

"تم انگریزی کے علاوہ اور زبانیں بھی جانتی ہو؟"

"ہاں صاحب میں جرمنی اور فرانسیسی زبانیں بھی جانتی ہوں"

"کونسی زبان تمہیں سب سے زیادہ پسند ہے؟"

"سب زبانیں ایک جیسی ہیں صاحب، میں کہہ نہیں سکتی کہ کونسی زبان دوسری سے اچھی ہے"

"تم کوئی شراب یا کافی پیو گی؟"

"نہیں صاحب، کیفے میں گاہکوں کے ساتھ بیٹھ کر پینے کی اجازت نہیں"

"سگار لو گی؟"

"نہیں صاحب" اس نے ہنستے ہوئے کہا "میں تمباکو نہیں پیتی"

"میں بھی نہیں پیتا"

"مجھے ڈیوڈ بیلاسکو سے اتفاق نہیں ہے"

"بیلاسکو، کون ہے صاحب؟"

"بیلاسکو، ڈیوڈ بیلاسکو۔ اس کی پہچان یہ ہے کہ اس کا کالر ہمیشہ پشت کی طرف ہوتا ہے، لیکن مجھے اس سے بالکل اتفاق نہیں ہے" اور اس کے علاوہ وہ اب مر چکا ہے"

"مجھے اجازت ہے صاحب؟" خادمہ نے کہا۔

"بالکل" ہیرس نے کہا۔ وہ کرسی پر آگے کی طرف بڑھ کر بیٹھ گیا۔ اور کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔ کمرے کے دوسرے سرے پر بوڑھے آدمی نے اپنا اخبار تہہ کر کے رکھ دیا۔ اس نے مسٹر ہیرس کی طرف دیکھا۔ اور پھر اپنا کافی کا پیالہ اور پرچ لے کر اس کی میز پر آگیا۔

"اگر میں مخل ہوا ہوں تو اس کے لیے معافی چاہتا ہوں" اس نے انگریزی میں کہا۔ "لیکن مجھے بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ شاید آپ بھی نیشنل جیوگریفک سوسائٹی کے رکن ہوں۔"

"تشریف رکھیے" ہیرس نے کہا۔ وہ صاحب بیٹھ گئے۔

"آپ کافی کا ایک اور پیالہ یا کوئی اور چیز پئیں گے؟"

"شکریہ" اس نے جواب دیا۔

"آپ میرے ساتھ کرش لیں گے؟"

"بشرطیکہ آپ بھی ساتھ شامل ہوں"

"نہیں صاحب آپ کو لینا پڑے گی" ہیرس نے خادمہ کو آواز دی۔ بوڑھے آدمی نے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب سے چمڑے کی ایک پاکٹ بک نکالی۔ اس نے ربڑ کا ایک بینڈ کھول کر بہت سے کاغذ نکالے اور پھر ان میں سے ایک چن کر ہیرس کے ہاتھ میں دے دیا۔

"یہ میرا رکنیت کا سرٹیفکیٹ ہے" اس نے کہا۔ "کیا آپ امریکہ میں فریڈرک جے رسل کو جانتے ہیں؟"

"مجھے افسوس ہے، میں اسے تو نہیں جانتا"

"وہ تو بڑا مشہور آدمی ہے"

"کہاں کا رہنے والا ہے؟ آپ کو معلوم ہے امریکہ کے کس حصے کا رہنے والا ہے؟"

"۔۔ اتھنگٹن کا، کیا سوسائٹی کا صدر دفتر یہیں نہیں ہے؟"

"میرا خیال ہے یہیں ہے"

"آپ کا خیال ہے۔ آپ کو یقینی طور پر علم نہیں؟"

"میں مدّت سے وطن واپس نہیں گیا" ہیرس نے کہا۔

"تو پھر آپ سوسائٹی کے رکن نہیں ہیں؟"

"نہیں، لیکن میرے والد ہیں، وہ کئی سال سے سوسائٹی کے رُکن ہیں"

"تو پھر وہ فریڈرک جے، رسل کو جانتے ہوں گے، وہ سوسائٹی کا عہدیدار ہے۔ میری رکنیت کی سفارش مسٹر رسل نے ہی کی تھی"

"مجھے یہ بات سُن کر بڑی مسرت ہوئی"

"مجھے یہ سُن کر بڑا افسوس ہُوا، کہ آپ رکن نہیں ہیں" لیکن آپ اپنے والد کے ذریعے سے رکنیت کے لیے نامزد ہو سکتے ہیں"

"درست فرمایا آپ نے" ہیرس نے کہا۔ "میں واپس پہنچوں گا تو ضرور اس کا رکن بن جاؤں گا"

"میرا بھی یہی مشورہ ہے۔ آپ سوسائٹی کا رسالہ تو پڑھتے ہوں گے؟"

"بے شک"

"کیا آپ نے وہ رنگین تصاویر دیکھی ہیں، جن میں شمالی امریکہ کے جانور دکھائے گئے تھے؟"

"ہاں، پیرس میں دیکھی تھیں"

"اور وہ پرچہ بھی دیکھا جس میں الاسکا کے آتش فشاں پہاڑ کے گردو پیش کے مناظر دکھائے گئے تھے"

"بڑی حیرت انگیز چیز تھی"

"میں نے بھی جارج شیرس سوم کی دی ہوئی جنگلی جانوروں کی تصاویر سے بڑا لطف اُٹھایا۔"

"ہاں کمبخت بڑی عمدہ تھیں"

"کیا فرمایا آپ نے؟"

"بڑی ہی عمدہ تھیں اور وہ میاں شیرس ــ"

"آپ اُس سے واقف ہیں؟"

"ہم پرانے دوست ہیں" ہیرس نے جواب دیا۔

"اچھا تو آپ جارج شیرس سوم سے واقف ہیں بڑا عجیب آدمی ہوا"

"ہاں میں سمجھتا ہوں کہ وہ میرے دوستوں میں سب سے زیادہ دلچسپ آدمی ہے؟"

"اور کیا آپ جارج شیرس دوم کو بھی جانتے ہیں، کیا وہ بھی دلچسپ آدمی ہے؟"

"نہیں وہ اتنا دلچسپ نہیں"

"میرا خیال تھا کہ وہ بھی بڑا دلچسپ آدمی ہوگا۔"

"واقعی یہ بڑی عجیب بات ہے، وہ اتنا دلچسپ نہیں ہے، اور مجھے خود حیرانی ہے کہ وہ دلچسپ کیوں نہیں ہے"

"میرا خیال تھا کہ اس خاندان کا ہر فرد بڑا دلچسپ ہوگا" اس نے کہا۔

"کیا آپ نے صحرا کے ریگستان کے مناظر دیکھے ہیں؟" ہیرس نے پوچھا۔

"صحرا کا ریگستان؟ اسے شائع ہوئے تو کوئی پندرہ سال ہوگئے ہیں"

"ہاں اتنا ہی عرصہ ہوا ہے۔ میرے والد کو یہ بڑے پسند تھے۔"

"آپ کے والد کو نئے نمبر پسند نہیں آتے۔؟"

"پسند تو شاید ضرور ہوں گے۔ لیکن صحرا کے مناظر کے وہ بڑے شائق تھے۔"

"تھے تو اچھے، لیکن علمی مفاد کے مقابلے میں اُن کی صنعت کارانہ وقعت زیادہ تھی۔"

"شاید،" ہیرس نے کہا۔ "لیکن تیز ہوا میں ریت کا وہ اُڑنا، اور اونٹ والے عرب کا ٹکٹ کی طرف مُنہ کر کے جھکنا، بڑا دلکش منظر تھا۔"

"مجھے تو کچھ ایسا یاد پڑتا ہے کہ عرب اپنے اُونٹ کی مہار تھامے کھڑا تھا۔"

ہاں، ہاں، ٹھیک ہے" ہیرس نے کہا۔ "مجھے کرنل لارنیس کی کتاب کی تصویر یاد آگئی تھی۔"

"لارنیس کی کتاب تو عرب کے متعلق ہے نا؟"

"بالکل" ہیرس نے کہا۔ "شاید اس عرب کے تصوّر نے میرے دماغ میں اُس تصویر کی یاد تازہ کر دی۔"

یہ کرنل لارنس بھی بڑا دلچسپ نوجوان ہو گا۔"

"ہاں، ضرور"

"کیا آپ کو معلوم ہے وہ آج کل کیا کر رہا ہے؟"

"وہ شاہی ہوائی فوج میں کام کر رہا ہے۔"

"یہ ہوائی فوج کی اُسے کیا سوجھی؟"

"اسے پسند ہے"

"کچھ آپ کو معلوم ہے وہ بھی نیشنل جیو گریفک سوسائٹی کا رکن ہے یا نہیں؟

"معلوم نہیں"

"اگر یہ بھی شامل ہو جائے تو بڑی اچھی بات ہے، اس قسم کے آدمی سوسائٹی کے رکن بننے چاہئیں۔ اگر سوسائٹی پسند کرے تو میں اسے نامزد کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

"میرا خیال ہے، انہیں تو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

"میں نے دیوی سے ایک سائنسدان کو نامزد کیا ہے" اور پھر لوزان سے اپنے ایک ہم پیشہ کو، ان دونوں کو منتخب کر لیا گیا ہے۔ اگر میں کرنل لائنس کو بھی نامزد کر دوں تو وہ بڑے ہی خوش ہوں۔"

"بڑا اچھا خیال ہے" ہیرس نے کہا۔ "کیا آپ اس [illegible] میں اکثر آتے رہتے ہیں؟"

"ہاں، رات کے کھانے کے بعد کافی پینے کے لیے یہیں آتا ہوں۔"

"اور آپ یونیورسٹی میں بھی ہیں؟"

"اب عملی طور پر تو نہیں"

"میں یہاں صرف گاڑی کا انتظار کر رہا ہوں" ہیرس نے کہا۔ "یہاں سے میں پیرس جاؤں گا، اور پھر ہاروسے سے جہاز پر سوار ہو کر امریکہ چلا جاؤں گا۔"

"میں کبھی امریکہ نہیں گیا، لیکن مجھے امریکہ دیکھنے کا بڑا اشتیاق ہے۔ شاید کبھی سوسائٹی کے اجلاس میں شامل ہونے کے لیے آؤں۔ مجھے آپ کے والد سے مل کر بڑی خوشی ہوگی۔"

"مجھے یقین ہے کہ انہیں بھی آپ سے مل کر بڑی مسرت ہوتی، لیکن پچھلے سال ان کا انتقال ہو گیا۔ بڑے تعجب کی بات ہے لیکن انہوں

نے خودکشی کر لی تھی۔"

"مجھے یہ سن کر واقعی بڑا افسوس ہوا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ان کے رخصت ہو جانے سے سائنس کو، اور ان کے خاندان کو بڑا ہی صدمہ پہنچا ہو گا۔"

"سائنس نے تو اسے بڑی خوبی سے برداشت کر لیا۔"

"یہ لیجئے میرا کارڈ" بیرس نے کہا۔ "والد اپنے نام کے ابتدائی حروف ای ڈی کے بجائے، ای جے لکھا کرتے تھے، مجھے یقین ہے کہ وہ آپ سے تعارف حاصل کر کے بڑے خوش ہوتے۔"

"میرے لیے بھی بڑی مسرت کی بات ہوتی" اس نے اپنی پاکٹ بک سے اپنا کارڈ نکال کر بیرس کو دیا۔ اس پر لکھا تھا۔

ڈاکٹر سگمنڈ وائر۔ پی، ایچ، ڈی ممبر نیشنل جیوگرافک سوسائٹی۔ واشنگٹن۔ ڈی، سی، امریکہ

"میں اسے بڑا سنبھال کر رکھوں گا" بیرس نے کہا۔

باپ اور بیٹے

شہر کی چوڑی سڑک کے درمیان میں ایک راستہ بدلنے کے لیے ایک بورڈ لگا تھا۔ لیکن موٹر گاڑیاں سیدھی نکل جاتیں، شاید اس خیال سے کہ یہ بورڈ کسی مرمّت کے لیے لگایا گیا ہوگا۔ جو اب تک مکمل ہو چکی ہوگی۔ نکولس ایڈمز اینٹوں کی بنی ہوئی پختہ سڑک پر سے گزرتا گیا، جو آج اتوار کے دن سنسان پڑی تھی۔ اور کہیں کہیں گاڑیوں کو روکنے اور چلانے کے لیے سرخ اور سبز بتیاں باری باری سے چمک رہی تھیں۔ اگر ان کی اُجرت نہ ادا کی گئی تو ممکن ہے یہ اگلے سال نظر ہی نہ آئیں۔ وہ آگے بڑھتا چلا گیا، یہاں تک، کہ اس چھوٹے سے شہر کے اُن بڑے بڑے درختوں کے نیچے پہنچ گیا جو، اگر آپ اس شہر کے باشندے ہیں تو آپ کے دل کے ٹکڑے ہیں۔ آپ کئی دفعہ ان کے گھنے سایوں تلے گھومے ہوں گے۔ یہ درخت بڑے سایہ دار ہیں جن کے نیچے دھوپ نہ ہونے کی وجہ سے مکان بھی گیلے گیلے رہتے ہیں۔ وہ شہر کی آبادی سے نکل کر بڑی شاہراہ پہ آگیا، جو کہیں چڑھتی اور کہیں اترتی ہوئی آگے ہی آگے

بڑھتی چلی جاتی تھی سڑک کے کناروں پر سرخ مٹی کے اونچے کنارے تھے جو بڑی صفائی سے کٹے ہوئے تھے اور نئے درختوں کی قطاریں دونوں طرف لگی تھیں۔ یہ اس کا اپنا علاقہ نہیں تھا۔ لیکن وسطِ خزاں میں اس علاقے میں موٹر گاڑی میں گزرنا بڑا خوشگوار معلوم ہوتا تھا۔ کپاس جمع کی جا چکی تھی۔ اور خالی کھیتوں میں کہیں کہیں مکئی کے پودے کھڑے تھے۔ وہ اپنی موٹر گاڑی آہستہ آہستہ چلا رہا تھا اور اس کا بیٹا اس کے ساتھ والی نشست پر سویا پڑا تھا۔ وہ سارا دن سفر کرتے رہے تھے۔ اور اب وہ اس قصبے کو پہچاننے لگ گیا تھا جس میں انہیں رات گزارنی تھی۔ نِک کو معلوم تھا کہ کون سے کھیتوں میں مکئی اگی ہوئی ہے اور کن کھیتوں میں سویابین یا مٹر کی کاشت ہو رہی ہے۔ کس جگہ جھاڑیاں ہیں اور کھیت کے کس رُخ پر جھونپڑیاں یا مکان ہیں۔ وہ اپنے تصور میں شکار کرتا ہوا گزر رہا تھا۔ وہ جانوروں کے دانہ چگنے اور چھپنے کی جگہوں کو تاک رہا تھا۔ اور اسے معلوم تھا کہ ان کے جھرمٹ کہاں ملیں گے۔ اور وہ اڑ کر کس رُخ جائیں گے۔

بٹیروں کا شکار کرتے ہوئے اگر کتے انہیں ڈھونڈ نکالیں تو ان کے جھرمٹ اور اُن کے چھپنے کی جگہ کے درمیان کبھی نہ کھڑے ہونا چاہیئے، ورنہ جب وہ اُڑ کر اُڑیں گے تو سیدھے آپ کی طرف آئیں گے۔ بعض سیدھے اُوپر چڑھ جائیں گے اور بعض فراٹے بھرتے ہوئے آپ کے کانوں کے پاس سے اس زور سے گزریں گے کہ ان کا جسم آپ کو اصل سے بہت بڑا معلوم دے گا۔ اُن کے شکار کرنے کا صرف یہی طریقہ ہے کہ آپ واپس مڑ کر جھاڑیوں میں اُترنے سے پہلے انہیں نشانہ کر لیں۔ اس علاقے میں بٹیروں کا شکار کرنے کی تربیت اس کے باپ نے دی تھی اس کا خیال آتے ہی نکولس ایڈمز کو اپنا باپ یاد آ گیا۔ باپ کا تصور کرتے ہی اُسے ہمیشہ سب

سے پہلے اس کی آنکھیں یاد آتیں ۔اس کا لمبا چوڑا جسم، اس کی پھرتیلی حرکات،
اس کے چوڑی چھاتی، اس کی عقاب سی ناک، اور اس کی چھوٹی سی ٹھوڑی
پر داڑھی ۔ ان چیزوں کا کبھی خیال بھی نہ آتا۔ صرف اس کی آنکھیں نمایاں
ہوتیں۔ گھنی بھنوؤں کے نیچے اس کی آنکھیں یوں نظر آتیں، جیسے اس
بیش بہا آلے کی حفاظت کے لیے قدرت نے خاص سامان مہیا کر رکھا
ہے۔ یہ آنکھیں اتنی جلدی اور اتنی دور کی چیز دیکھ لیا کرتی تھیں، کہ کسی
انسانی آنکھ سے ممکن ہی نہ تھا۔ یہ انمول تحفہ قدرت نے اسے عطا کر رکھا
تھا۔ اس کے باپ کی نظر اتنی تیز تھی کہ جیسے مار خور یا عقاب کی نظر تیز
ہوتی ہے۔

ایک دفعہ وہ جھیل کے اس کنارے پر کھڑے تھے۔ اور نکولسن ایڈمز
کی نظر بھی بچپن میں بہت اچھی تھی، کہ اس کے باپ نے کہا "وہ جانور جھنڈے
کے اوپر سے نکل گئے ہیں" نِک کو نہ جھنڈا نظر آتا تھا اور نہ جھنڈے کا
بانس۔ "وہ دیکھو تمہاری بہن ڈارتھی کھڑی ہے اور جھنڈا اٹھائے ہوئے
گودی کی طرف آ رہی ہے"

نِک جھیل کے پار نظریں دوڑاتا تو اسے درختوں سے اٹھا ہوا کنارا
نظر آتا۔ اس کے پیچھے بڑے بڑے درختوں کا جنگل، ان کی اپنی زمین کے
ٹیلے اور درختوں کی اوٹ میں اپنا سفید گھر، لیکن اسے نہ تو گودی نظر آتی
اور نہ جھنڈا۔ اسے صرف جھیل کا ریتیلا ساحل نظر آتا رہا اس کا مڑتا ہوا کنارا۔

"تمہیں اس پہاڑی پر بھیڑیں نظر آ رہی ہیں؟"

"ہاں"

پہاڑی چراگاہ کے گہرے سبز رنگ میں ایک سفید سا ٹکڑا نظر آ رہا تھا۔

"میں انہیں گن بھی سکتا ہوں" اس کا باپ کہتا۔

ان تمام لوگوں کی طرح جن میں کوئی غیر معمولی استعداد ہوتی ہے، اس کا باپ بھی بڑا عصبی المزاج اور جذبات کا غلام تھا۔ اور جیسا کہ جذباتی قسم لوگوں کا قاعدہ ہے؛ وہ سخت گیر اور منہ پھٹ بھی تھا۔ اس کے علاوہ وہ بڑا بدقسمت تھا۔ جس میں دوسرے بھی اس کے شریک تھے۔ اس کی موت کا باعث ایک ایسا جال تھا جس کے بچھانے میں اس نے بس ذرا سا حصہ لیا تھا۔ لیکن اس کے شریکوں نے مختلف طریقوں سے اس کی موت سے پہلے سارا الزام اسی کے سر تھوپ دیا تھا۔ جذباتی آدمیوں کو اکثر ایسے الزام دیئے ہی جاتے ہیں۔ نِک ابھی اپنے باپ کے متعلق کچھ لکھنا نہ چاہتا تھا۔ اگرچہ کچھ عرصہ بعد اس نے لکھنے کا ارادہ کر رکھا تھا۔ لیکن اس بٹیروں کے علاقے میں اسے اپنے باپ کا وہ زمانہ یاد آگیا جب نِک ابھی بچہ ہی تھا۔ مچھلی اور جانوروں کے شکار کے ضمن میں وہ اپنے باپ کا مرہونِ منت تھا۔ اس کا باپ ان دو باتوں میں اتنا ہی شائق تھا جتنا وہ جنسیات کے معاملے میں خام تھا۔ نِک کے لیے باپ کی یہ افتادِ طبیعت بڑی خوشگوار ثابت ہوئی۔ شکار کے لیے یہ ضروری ہے کہ آپ کو پہلے پہل کوئی بندوق دے یا اسے استعمال کرنے کا موقع بہم پہنچائے۔ اور شکار کا فن سیکھنے کے لیے آپ کا ایسی جگہ رہنا بھی ضروری ہے۔ جہاں مچھلی اور جانور بکثرت پائے جائیں۔ آج جب کہ اس کی عمر اڑتالیس سال کی ہو چکی تھی۔ مچھلی اور جانوروں کے شکار میں اسے اتنی ہی مسرت ہوتی تھی، جتنی کہ بچپن میں اپنے باپ کے ساتھ۔ اسے پہلے شکار میں شامل ہوتے وقت حاصل ہوئی تھی۔ اس کے شکار کے شوق میں آج تک کمی واقعہ نہ ہوئی تھی، اور وہ اپنے باپ کا ممنون

تھا جس نے یہ شوق اس کے دل میں پیدا کیا تھا۔
دوسرا معاملہ جس میں اس کا باپ خام تھا۔ ایسا ہے کہ اس کے سارے لوازمات انسان کے پاس پہلے ہی سے موجود ہوتے ہیں اور اس کے متعلق جتنے علم کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہر آدمی بغیر کسی دوسرے آدمی کے مشورے کے سب کچھ خود ہی سیکھ جاتا ہے۔ چاہے وہ کہیں بھی رہتا ہو۔ اسے اب تک وہ دو موقعے یاد تھے۔ جن میں اس کے باپ نے اس ضمن میں کچھ معلومات بہم پہنچائی تھیں۔ ایک موقعہ وہ تھا، جب نِک نے تیکوان کے درخت پر سے ایک سرخ گلہری کا نشانہ کیا تھا۔ گلہری زخمی ہو کر نیچے گر پڑی، جب نِک نے اُسے اُٹھایا تو اس نے نِک کے انگوٹھے میں سامنے کے سُرخ اپنے دانت گاڑ دیئے۔
"ننھا غلیظ بگر" نِک نے درد سے چلاتے ہوئے کہا اور پھر اس کا سر ایک درخت کے تنے پر دے مارا۔ "دیکھئے اس نے کیسے کاٹا ہے!"
اس کے باپ نے دیکھ کر کہا "زخم کو منہ سے چوس لو، اور جب گھر پہنچو گے تو اس پر آئیوڈین لگا لینا!"
"ننھا بگر" نِک نے پھر کہا۔
"تمہیں معلوم ہے بگر کس کو کہتے ہیں؟" اس کے باپ نے پوچھا۔
"ہم ہر چیز کو بگر کہہ لیتے ہیں" نِک نے کہا۔
"بگر، اس آدمی کو کہتے ہیں، جو حیوانوں کے ساتھ خلافِ وضعِ فطری کا مرتکب ہو!"
"کیوں؟" نِک نے کہا۔
"معلوم نہیں کیوں" اس کے باپ نے کہا، "لیکن یہ بڑا سنگین جرم

سے ہے۔"

نِک کے تخیّل میں جوش اور خوف کے ملے جُلے جذبات کی ایک لہر اُٹھی
اس نے کئی حیوانوں کے متعلق تصور کیا، لیکن ان میں کچھ جاذبیت ، یا
عملی موزونیت نہ پائی۔ اس کے باپ نے جو جنسی معلومات بہم پہنچائے
اُن کا ماحصل بس اتنا ہی تھا۔ وہاں ایک اور موقع بھی آیا جب اس نے
ایک اخبار میں پڑھا کہ انریکو کروسو کو دست درازی کے جرم میں گرفتار
کر لیا گیا۔

" دست درازی کیا ہوتی ہے؟"

" یہ بڑا ہی خوفناک جرم ہوتا ہے " اس کے باپ نے جواب دیا۔ نِک کے
تخیل نے ایک ایسی تصویر پیش کردی۔ جس میں یہ مغنی کسی خوبصورت عورت
کے ساتھ کسی دندانے دار اوزار سے کوئی بڑی ہی عجیب، وحشیانہ، اور
خوفناک حرکت کر رہا تھا۔ اس عورت کی شکل وصورت اینا ہیلڈ کی اس تصویر سے
ملتی جُلتی تھی، جو سگاروں کے ڈبے کے ڈھکنے پر چھپی ہوئی ہوتی ہے اس نے
سوچا کہ جب میں کافی عمر کا ہو جاؤں گا تو میں بھی کم از کم ایک مرتبہ اس کا تجربہ
ضرور کروں گا۔

اس کے باپ نے اس ساری گفت گو کا خلاصہ یوں بیان کیا کہ بلق سے
انسان اندھا ہو جاتا ہے۔ پاگل بھی ہو جاتا ہے اور پھر مر بھی جاتا ہے۔ اور
جو شخص بازاری عورتوں کے پاس جاتا ہے، وہ بڑی خطرناک خفیہ امراض۔
کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس لیے بچاؤ اس میں ہے کہ انسان ان باتوں سے
بچتا رہے۔ اس کے باپ کی دونوں آنکھیں بڑی خوبصورت تھیں۔ نِک کو
اس سے بڑی محبت تھی۔ اور بڑی دیر تک اس سے محبت کرتا رہا تھا۔

اب جب کہ وہ ان باتوں کو سمجھ سکتا تھا۔ ان پرانی باتوں کی یاد جب حالات خراب ہو گئے تھے ۔ بڑی ناخوشگوار تھی۔ اگر وہ ان حالات کو لکھ دیتا ، تو اس کی طبیعت پر سے ان کا بوجھ اتر جاتا ، کیونکہ کئی باتوں کو لکھ کر اس نے مخلصی حاصل کر لی تھی ۔ لیکن ان کو لکھنا ابھی ابھی مناسب نہ تھا۔ ابھی ان میں سے بہت سے آدمی زندہ تھے ، چنانچہ اس نے اپنی توجہ کسی اور طرف پھیرنے کی کوشش کی۔ اس نے اپنے باپ کے متعلق کئی دفعہ سوچا تھا ، لیکن ابھی اس کے متعلق کچھ بھی نہ کیا جا سکتا تھا۔ تجہیز و تکفین کرنے والے نے جو محنت اس کے باپ کے چہرے کو درست کرنے کے لیے کی تھی ، اسے ابھی تک یاد تھی ۔ اور اس کے علاوہ باقی باتیں جن میں الزامات بھی شامل تھے ۔ اسے ابھی تک نہ بھولی تھیں ۔ اس نے تابوت بردار کے کام کی تعریف کی تھی ۔ اور اس نے بھی اپنی کارگزاری پر بڑا فخر محسوس کیا تھا اور خوش ہوا تھا ، لیکن اس کے آخری خدوخال کے بارے میں تابوت بردار کا ہاتھ نہ تھا۔ تابوت بردار نے تو صرف چند مشکوک نشانات کو مٹانے کی کوشش کی تھی۔ چہرہ تو اس کی زندگی ہی میں کچھ عرصے سے خاص شکل اختیار کرتا جا رہا تھا ، آخری تین سالوں میں یہ بہت زیادہ بدل گیا تھا ۔ یہ واقعات اگر لکھے جاتے تو بڑے دلچسپ ہوتے ۔ لیکن ان واقعات سے متعلق ابھی بہت سے آدمی زندہ تھے ۔

ابتدائی مرحلوں کے متعلق نِک کی اپنی معلومات میں اضافہ اس طرح ہندیوں کی بستی کے پیچھے شیکوان کے جنگلوں میں ہوا ۔ اس جگہ پہنچنے کے لیے ان کے مکان سے ایک پگڈنڈی جنگلوں میں سے ہوتی ہوئی کھیتوں کو جاتی تھی ۔ اور پھر ایک سڑک جو کٹی پھٹی درانٹوں میں سے گھومتی ہوئی اس بستی تک پہنچتی تھی اگر اس تمام راستے پر ننگے پاؤں چلا جائے تو سب سے پہلے

مکان کے عقب میں چیڑ کی تیلیوں کا گندھا ہوا گارا شیکوان کے جنگلوں میں روندنا پڑتا تھا، جہاں بڑے بڑے درختوں کے تنے امتداد زمانہ سے بورے کی شکل میں تبدیل ہو رہے تھے اور جس درخت پر بجلی گری تھی اس کی لمبی لمبی شاخیں نیزوں کی طرح لٹکی ہوئی تھیں، نالے عبور کرنے کے لیے ایک درخت کا تنا پڑا ہوا تھا جسے پار کر کے کالے رنگ کی کیچڑ نظر آتی تھی جنگل کی باڑ کو پار کر کے پگڈنڈی دھوپ کی وجہ سے سوکھی اور سخت ہو گئی تھی۔ اور اس پہ گھاس اور کھٹی بوٹی اُگ رہی تھی۔ بائیں طرف نالے کی دلدل تھی، جہاں پلاود اپنا پیٹ بھرتے تھے۔ یہیں طویلہ بھی تھا جس میں تازہ گوبر کے ڈھیر لگے تھے۔ اور سوکھی کھاد بھی رکھی تھی۔ پھر ایک اور جنگلا آتا تھا جس کے پار پگڈنڈی کی زمین سخت اور گرم تھی۔ یہ پگڈنڈی طویلے سے گھر تک جاتی تھی۔ اور وہ گرم ریتلی سڑک جو نالے کو پل کے ذریعے عبور کر کے جنگل تک جاتی تھی۔ یہاں ایک پودا اُگتا ہے، جسے تیل میں بھگو کر رات کے وقت جلاتے ہیں۔ اور ان کی روشنی میں نیزوں کے ساتھ مچھلیاں پکڑتے ہیں

اس کے بعد بڑی سڑک بائیں طرف مڑتی ہے اور جنگل کے کنارے کنارے پہاڑ پر چڑھتی ہے۔ جنگل میں جانے کے لیے کچی سڑک ہے جس پر پتھروں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے پھیلے ہوئے ہیں، درختوں کے گھنے سایوں کی خنکی ہے۔ یہ راستہ کافی چوڑا کیا ہوا ہے تاکہ سرخ ہندی اس پر سے آسانی کے ساتھ شیکوان کا اتارا ہوا چھلکا گھسیٹ کر لا سکیں۔ شیکوان کا چھلکا بڑے بڑے ڈھیروں میں لمبی قطاروں کے اندر پڑا رہتا تھا۔ اور ان پر جھونپڑیوں کی طرح چھلکوں ہی کو چھت بنا دیا جاتا تھا۔ درختوں کے عظیم الشان زرد رنگ کے تنے وہیں پڑے سڑتے تھے، جہاں انہیں کاٹ کر گرایا جاتا تھا۔

جنگل میں یہ ستے یونہی سڑنے کے لیے چھوڑ دیئے جاتے۔ یہاں تک کہ ان کی شاخیں بھی جلانے کے لیے نہ کاٹی جاتیں۔ انہیں صرف چھلکے کی ضرورت ہوتی تھی، جو براؤن ستی کے چمڑا رنگنے کے کارخانوں کے لیے۔ سردیوں کے موسم میں تخ بستہ جھیل کی سطح پر سے گھسیٹے ہوئے لے جاتے۔ ہر سال جنگل کٹتا جاتا۔ اور بے سایہ جگہ بڑھتی جاتی تھی۔

لیکن اُن دنوں جنگل ابھی کافی وسیع تھا۔ اُونچے اُونچے درختوں والا ایسا جنگل جس کو ابھی کسی نے ہاتھ نہ لگایا تھا۔ جب آپ زمین پر بچھے ہوئے تیلیوں کے فرش پر چلتے تو وہ کمانیوں کی طرح لچک دار محسوس ہوتا۔ اس پر کوئی جھاڑیاں بھی نہ اُگتی تھیں۔ یہاں گرم ترین دنوں میں خنکی ہوا کرتی تھی۔ وہ تینوں شیکوان کے تنے کے ساتھ سہارا لیے لیٹے تھے، یہ تنا اتنا چوڑا تھا جتنی دو چارپائیوں کی لمبائی ہوتی ہے۔ درختوں کی چوٹیاں ہوا سے ہل رہی تھیں۔ اور ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں میں دھوپ کی کرنیں چھن چھن کر آ رہی تھیں۔ بِلی بولا:

”تمہیں تھوڑی پھر چاہیے؟“

”تم چاہتے ہو؟“

”آؤں مجال“

”تو آؤ پھر“

”نہیں، یہیں“

”لیکن بلی یہیں —“

”اِس کا کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ تو میرا بھائی ہے۔“

اِس کے بعد بھی وہ تینوں بیٹھے رہے اور درخت کی گھنی شاخوں میں کالی

گلہری کو تاکتے رہے جو نظر نہ آتی تھی۔ وہ اس بات کا انتظار کر رہے تھے کہ وہ پھر بولے۔ کیونکہ بولتے ہوئے جب وہ دُم ہلائے گی تو نک اُسے گولی کا نشانہ بنا سکے گا۔ اس کا باپ اُسے ہر روز صرف تین کارتوس دیا کرتا تھا۔ اس کے پاس ایک نالی کی سنگل بندوق تھی۔

"یہ لگتی ہے بنا ہی نہیں" نِک بولا۔

"تم گولی چلاؤ نِکی، وہ ڈر کر بھاگے گا تو نظر آجائے گا۔ پھر دوسری گولی سے اُسے مار لینا" ٹروڈی بولی

"میرے پاس صرف دو ہی کارتوس رہ گئے ہیں" نک نے کہا۔

"کتیا کا بچہ!" بلی نے کہا

وہ درخت سے سہارا لگائے خاموشی سے بیٹھے رہے۔ نک کی طبیعت اس وقت بڑی مسرور تھی۔

"جن تزار تھی۔ ایڈی کہتا ہے کہ وہ کسی رات چپکے سے آکر تمہارے بستر میں گھس جائے گا۔"

"کیا کہا؟"

"وہی کہتا ہے۔"

ٹروڈی نے سر ہلایا۔

"بس اتنا ہی چاہتا ہے۔" ٹروڈی نے کہا۔ ایڈی ان کا سوتیلا بھائی تھا اور عمر میں ان سے بڑا تھا۔ اس کی عمر سترہ سال تھی۔

"اگر ایڈی کبھی رات کے وقت تمہارے پاس آیا۔ اور اس نے تمہارے ساتھ بات بھی کی تو تمہیں معلوم ہے میں اس کا کیا حال کروں گا؟ تب اُسے یوں مار دوں گا" نک نے بندوق کا گھوڑا چڑھا دیا، اور بغیر نشست لئے لبلبی دبا دی

: سپنے تصور میں اس نے اپنے دوغلی نسل کے حرامی بھائی ایڈی گلبی کے سر یا پیٹ میں ہتھیلی جتنا پتھر اٹھا کر دے مارا۔ "میں اسے یوں قتل کر دوں گا۔ یوں اسی طرح۔"

"تو پھر اس کے لیے یہی بہتر ہے کہ وہ آنے کا ارادہ ہی نہ کرے۔" ٹروڈی نے کہا اور اپنا ہاتھ نک کی جیب میں ڈال دیا۔

"ہاں اسے خبردار رہنا چاہیے۔" بلی نے کہا۔

"وہ بڑا اچھی بات ہے۔" ٹروڈی نک کی جیب میں ہاتھ ڈالے کچھ ٹٹول رہی تھی۔ "لیکن تم اسے قتل نہ کرنا۔ اس سے اپنے آپ کو مصیبت پڑ جاتی ہے۔"

"میں اسے اسی طرح ماروں گا۔" ایڈی گلبی کی لاش اسے تصور میں زمین پر پڑی نظر آ رہی تھی۔ اس کے سینے میں زخم ہو رہا تھا۔ نک نے فخریہ انداز میں اس پر اپنا پاؤں رکھ دیا۔

"میں اس کی کھوپڑی پر سے کھال نوچ لوں گا۔" اس نے بڑی مسرت سے کہا۔

"نہ نہ۔" ٹروڈی نے کہا۔ "یہ بڑا نفرت انگیز کام ہے۔"

"میں اس کی کھوپڑی چھیل کر اس کی ماں کے پاس بھیج دوں گا۔"

"اس کی ماں تو مر چکی ہے۔" ٹروڈی نے کہا۔ "اسے قتل نہ کرنا نکی۔ تمہیں میری وجہ سے قتل نہ کرنا۔"

"اس کی کھوپڑی چھیل کر اس کی لاش کتوں کے آگے ڈال دوں گا۔"

بلی کی طبیعت بڑی افسردہ ہو رہی تھی۔ "اسے خبردار رہنا چاہیے۔" اس نے غمگین آواز سے کہا۔

"کتے اسے چیر پھاڑ کر رکھ دیں گے۔" نک نے اس لاش کی حالت کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اس دو غلے غدار کی برہنہ کھوپڑی والی لاش کو کتوں سے نچوانے کے بعد بھی اس کا دل نہ پسیجا۔ تر دوڑی نے اس کے گلے میں باہیں ڈال کر زور سے بھینچ لیا، اور چلا چلا کر کہنے لگی۔ "اسے نہ مارنا، اسے نہ مارنا۔ اسے نہ مارنا۔ نہ مارنا نکی، نکی، نکی۔"

"تمہیں کیا ہو گیا ہے۔"؟

"بس اسے نہ مارنا"

"میں اسے ضرور قتل کروں گا۔"

"وہ صرف شیخیاں بگھارتا ہے۔"

"اچھا چلو، میں اسے نہ ماروں گا۔" نکی نے کہا۔ "ہاں اگر وہ تمہارے گھر کی طرف آیا تو پھر نہ چھوڑوں گا۔ اب چھوڑو مجھے۔"

"اب ٹھیک ہے۔" تر دوڑی نے کہا۔ "اب بتاؤ کچھ کرنا چاہتے ہو؟ میری طبیعت اب ٹھیک ہے۔"

"ہاں، اگر بلّی ادھر ادھر ہو جائے۔" نک نے ایڈی گلبی کو پہلے تو قتل کیا پھر اس کی جان بخشی کر دی۔ وہ اب اپنے آپ کو بڑا جواں مرد محسوس کر رہا تھا۔

"جاؤ بلی تم ہمارے فارغ ہونے تک ادھر ادھر گھوم آؤ۔ جاؤ۔"

"کتیا کا بچہ" بلی بولا۔ "میں تو اکتا گیا ہوں۔ ہم یہاں شکار کرنے آئے تھے یا کچھ اور؟"

"اچھا تم بندوق لے جاؤ۔ ایک کارتوس ابھی باقی ہے۔"

"ٹھیک ہے میں ایک موٹی تازی کالی گلہری مار ہی لوں گا۔"

"اور میں بھی اپنا کام کر لوں گا۔"

اس کے بعد کتنی ہی دیر گزر گئی لیکن بلّی واپس نہ آیا۔

"تمہارا کیا خیال ہے ہم کوئی بچّہ بنا رہے ہیں؟" ٹروڈی نے اپنی گندمی ٹانگیں لپیٹ لیں۔ اور اپنا جسم اس کے ساتھ ملنے لگی۔ نک کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے اندر سے کوئی چیز نکل کر بہت دُور چلی گئی ہے۔

"میرا تو خیال نہیں ہے۔"

"کچھ پروا نہ کرو۔ بہت سے بچّے بنا ڈالو۔"

بلّی کے بندوق چلانے کی آواز آئی۔

"شاید اس نے کچھ مار لیا ہے۔"

"چھوڑو اسے" ٹروڈی بولی۔

بلّی درختوں میں سے ہوتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ بندوق اس کے کندھوں پر تھی اور ایک کالی گلہری کو اگلے پنجوں سے پکڑ کر لٹکائے چلا آتا تھا۔

"دیکھو۔ بلّی سے بھی بڑا ہے۔ تم فارغ ہو چکے؟"

"کہاں سے ملا؟"

"اس جگہ۔ میں نے اسے اچھلتے ہوئے دیکھ لیا۔"

"اب مجھے گھر جانا ہے" نک نے کہا۔

"مت جاؤ" ٹروڈی بولی۔

"نہیں، مجھے ابھی کھانا کھانا ہے۔"

"اچھا جاؤ۔"

"یہ گلہری تم لے لو۔"

"اچھا"

"کھانے کے بعد آؤ گی؟"

"نہیں"

"طبیعت کیسی ہے"؟

"بالکل ٹھیک ہے"

"میں جاتا ہوں"

"مجھے ایک بوسہ تو لے لینے دو"، ٹروڈی نے کہا۔

اب اس شاہراہ کو موٹر گاڑی میں طے کرتے ہوئے اور بڑھتی ہوئی تاریکی میں نِک سادا آہستہ آہستہ اپنے باپ کی باتیں یاد کرتا رہا۔

شام کے وقت اسے کبھی باپ یاد نہ آتا تھا۔ شام کے وقت وہ ہمیشہ اکیلا ہی رہتا تھا، اور اس وقت اسے تنہائی بڑی پسند آتی تھی۔ اسے اپنے باپ کی یاد ہمیشہ موسمِ خزاں کے آخر میں یا بہار کے شروع میں آیا کرتی تھی جب سبزہ زاروں میں پرندے نظر آنے لگتے، یا وہ مکی کے پودے دیکھتا، یا کوئی جھیل نظر آتی یا جب کبھی وہ کوئی بگھی اور گھوڑے دیکھتا، یا مرغابیوں کی آواز سنتا، تو اسے وہ وقت بھی یاد آجاتا، جب تیز ہوا اور برفباری میں ایک عقاب تنے ہوئے کپڑے پر آن گرا تھا۔ اس کے تیز ناخون کپڑا پھاڑ کر اندر گھس گیے اور وہ رہائی پانے کے لیے زور سے پھڑپھڑا رہا تھا۔ کسی سنسان باغیچے، تازہ ہل پھرے ہوئے کھیتوں، جھاڑیوں، چھوٹے چھوٹے ٹیلوں، سوکھے ہوئے گھاس پر چلتے ہوتے، لکڑیاں پھاڑتے ہوئے، یا پانی نکالتے ہوئے، چکّی یا سیب کی شراب نکالنے والے کارخانوں کے پاس اور جلتے ہوئے الاؤ کے پاس اسے باپ کا خیال ضرور آجاتا۔ جن شہروں میں آج

کل نک کا روبار تھا۔ اس کا باپ ان شہروں سے واقف بھی نہ تھا۔ پندرہ سال کے بعد اس کا اور اس کے باپ کا کسی بات میں بھی ساجھا نہ رہا تھا۔

سردیوں کے دنوں میں اس کے باپ کی ڈاڑھی میں برف جیسی رہتی اور گرمیوں میں اسے بڑا پسینہ آیا کرتا تھا۔ اسے دھوپ میں کھیتوں کے اندر کام کرنے کا بڑا شوق تھا۔ حالانکہ اسے اس کی ضرورت نہ تھی۔ اسے مشقت طلب کام بڑے پسند تھے حالانکہ نک ان سے متنفر تھا۔ نک کو اپنے باپ سے تو محبت تھی، لیکن اس کے جسم سے جو بو آتی تھی، اس سے بے حد نفرت تھی۔ ایک دفعہ اسے باپ کی بنیان اور دوسری بنیان پڑی، جو استعمال سے چھوٹی ہو گئی ہوئی تھی۔ ان کی بو سے اسے متلی ہونے لگی۔ نک نے انہیں اتار کر ایک پتھر کے نیچے چھپا دیا۔ اور گھر میں کہہ دیا کہ انہیں کھو گئے ہیں۔ اس نے باپ سے کہا بھی کہ ان سے بو آتی ہے لیکن باپ نے کہا تھا کہ یہ تو تازہ دھلے ہوئے ہیں۔ اور واقعی وہ تازہ دھلے ہوئے تھے۔ جب نک نے کہا کہ انہیں سونگھ کر دیکھئے تو اس نے غصے سے ناک چڑھا لی اور بولا کہ یہ بالکل صاف ہیں۔ جب نک نے مچھلیوں کے شکار سے واپس آکر ان کے گم ہونے کی بات کہی تو باپ نے اسے جھوٹ بولنے پر خوب پیٹا۔

مار کھانے کے بعد وہ تختوں کے بنے ہوئے کمرے میں جا بیٹھا جس کا دروازہ کھلا تھا۔ بھری ہوئی بندوق اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس کا باپ سامنے دالان کے برآمدے میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ نک نے سوچا، "یہاں سے میں اسے جہنم رسید کر سکتا ہوں۔ میں بڑی آسانی سے اس کی جان لے سکتا ہوں۔" تھوڑی دیر کے بعد اس کا غصہ کچھ کم ہوا، اور اسے

اس بات کا خیال آیا، کہ یہ بُو وقتی اُسی نے سے کر دی ہوئی ہے۔ وُہ اپنے جسم سے بدبو ہٹانے کے لیے رات کے اندھیرے میں ہندیوں کے کیمپ کی طرف نکل گیا۔ ان کے کنبے میں صرف ایک فرد ایسا تھا جس کی بُو اسے پسند تھی۔ اور وہ اس کی بہن تھی۔ باقی سب سے وُہ تعلق پیدا کرتے ہوئے گھبراتا تھا۔ جب اس نے تمبا کو نوشی شروع کی تو بدبو کا یہ احساس بھی زائل ہو گیا۔ یہ بھی اچھا ہی ہوا۔ حسِ شامہ کی تیزی شکاری کتّے کے لیے تو مفید ہو سکتی ہے لیکن انسان کے لیے اس کا کوئی خاص فائدہ نہیں۔

"بابا، بچپن میں ان ہندیوں کے ساتھ مل کر شکار کرنا تمہیں کیسا لگتا تھا۔؟"

"کچھ یاد نہیں،" نک نے چونک کر کہا۔ اُسے خیال بھی نہ آیا تھا کہ بچہ اب بیدار ہو چکا ہے۔ اُس نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے بچے کی طرف دیکھا۔ وُہ اپنے آپ کو بالکل تنہا محسوس کر رہا تھا۔ حالانکہ یہ لڑکا اس کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اور معلوم نہیں کب سے جاگ رہا تھا۔ "ہم سارا سارا دن کالی گلہریوں کا شکار کرتے پھرتے تھے" اس نے بچے سے کہا "میرا باپ مجھے صرف تین کارتوس روزانہ دیا کرتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اس سے شکار کی مشق ہو جائے گی۔ بیکار پھرنا اسے بے حد ناپسند تھا۔ میں ایک اور لڑکے بلّی گلبی، اور اس کی بہن ٹروڈی کے ساتھ شکار کے لیے نکلا کرتا تھا۔ گرمیوں کے ایک موسم میں تو ہم روز بلا ناغہ شکار کرتے رہے ہیں:

"ہندیوں کے لیے یہ کچھ عجیب سے نام نہیں؟"

"ہاں، ہیں تو سہی،" نک نے جواب دیا۔

"ہاں، یہ تو بتلائیے کہ یہ بہن بھائی کس طرح کے تھے؟"
"وہ اوجبوے (Ojibway) قبیلے کے تھے اور بڑے اچھے تھے۔"
"لیکن ان کا ساتھ کیسا تھا؟"
"اسے الفاظ میں بیان کرنا کچھ مشکل سا ہے۔" نِک ایڈمز نے کہا۔
کیا وہ اس بچے کو بتا سکتا ہے کہ اس لڑکی نے سب سے پہلے وُہ کام کیا جو اس سے بہتر طور پر اور کوئی نہ کر سکا تھا۔ اور کیا اس کی بھری بھری ٹانگوں، سپاٹ پیٹ، چھوٹی چھوٹی سخت چھاتیوں، مضبوط گرفت والی بانہوں، اشتیاق سے ڈھونڈنے والی زبان، تیز آنکھوں، منہ کے خوشگوار مزے کے متعلق کچھ کہہ سکتا ہے؟ اور پھر بڑے اضطراب سے، مضبوطی سے، ادا سے، ہنسی سے، محبت سے، کساؤ سے، درد سے، پوری طرح سے، انجام کو پہنچتے ہوئے، نہ ختم ہوتے ہوئے، انجام کو پہنچے بغیر، اور پھر ایک دم انجام کو پہنچتے ہوئے، ایسے جیسے اُلو کی طرح کا کوئی بڑا سا پرندہ شام کے دھندلکے میں آموجا تے۔ لیکن یہ سادی بات جنگل میں دن کے وقت ہوتی تھی، اور ہیکوان کی تیلیاں پیٹ میں چبھ جاتی تھیں۔ جب آپ کسی ایسی جگہ جائیں جہاں سے ہندی کوچ کر چکے ہوں تو اُن کے رخصت ہو جانے کی بُو آتی رہتی۔ سب درد رفع کرنے والی دواؤں کی خالی بوتلیں، اور بھنبھناتی ہوئی مکھیاں گھاس کی اس بھینی بھینی خوشبو کو، دھوئیں کی بُو اور نئے لومڑ کی تازہ تازہ بھس بھری کھال جیسی بساندھ کو دُور نہیں کر سکتیں۔ یہ بُو نہ تو بوڑھی ہندی عورتوں کے متعلق مذاق کرنے سے رفع ہوتی ہے اور نہ ہی وہ اسے ساتھ لے جاتی ہیں۔

اور دوسری بات کے متعلق یہ ہے کہ اگر آپ ایک اُڑتا ہوا پرندہ مار لیں تو یوں سمجھئے جیسے آپ نے سب اُڑتے ہوئے پرندے مار لیے۔ پرندے سب ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں اور وہ مختلف طریقوں سے اڑتے ہیں۔ لیکن ان کے شکار کا احساس ایک ہی طرح کا ہوتا ہے۔ اور پہلے اور آخری شکار میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اس کے لیے کہ وہ اپنے باپ کا احسانمند تھا۔

"ممکن ہے تمہیں وُہ پسند نہ آئیں"۔ نِک نے لڑکے سے کہا۔ "لیکن میرا خیال ہے کہ تم انہیں پسند ہی کرو گے"۔

"اور میرا دادا بھی اپنے بچپن میں ان لوگوں کے ساتھ رہتا رہا ہے ہے نا؟"

"ہاں۔ اور جب کبھی میں اس سے پوچھتا کہ یہ کیسے لوگ ہیں؟ تو وُہ یہی جواب دیتا کہ اُن میں کئی میرے دوست ہیں"۔

"میں بھی کبھی ان میں رہوں گا؟"

"اس کا میں کیا جواب دوں"، نِک نے کہا "یہ تمہاری اپنی مرضی ہے"
"کتنی عمر میں آپ مجھے شکاری بندوق دیں گے۔ اور اکیلے شکار کرنے کی اجازت ملے گی؟"

"اگر میں نے دیکھا کہ تم اس معاملے میں کافی محتاط ہو تو بارہ سال کی عمر میں تمہیں بندوق مل جائے گی"۔

"کاش میں اب بارہ سال کا ہوتا"۔

"اب تھوڑی ہی مدت باقی ہے"

"میرا دادا کس قسم کا آدمی تھا؟ مجھے اس کی صرف اتنی بات یاد ہے

کہ جب میں فرانس سے آیا تو اس نے مجھے ہوائی بندوق اور امریکا کا جھنڈا دیا تھا۔ وہ کس قسم کا آدمی تھا؟"

"اسے الفاظ میں بیان کرنا بڑا مشکل ہے۔ پرندوں اور مچھلیوں کے شکار میں وہ بڑا ماہر تھا، اور اس کی آنکھیں تو حیرت انگیز تھیں۔"

"کیا وہ آپ سے بھی اچھا شکاری تھا۔؟"

"اس کا نشانہ مجھ سے بہت ہی اچھا تھا۔ اور اس کا باپ اڑتے ہوئے جانور کو مارنے میں اس سے بھی زیادہ ماہر تھا۔"

"مجھے تو یقین نہیں آتا کہ وہ آپ سے اچھا شکاری ہو۔"

"ہاں ہاں، وہ واقعی بے نظیر نشانہ کرتا تھا۔ وہ بہت تیزی سے اور اس خوبصورتی کے ساتھ نشانہ کرتا تھا، کہ ویسا نشانہ کرتے ہوئے آج تک میں نے کسی کو نہیں دیکھا، میرے شکار کو دیکھ کر وہ مایوس ہو جاتا تھا۔"

"ہم دادا کی قبر پر کبھی فاتحہ کے لئے کیوں نہیں جاتے؟"

"ہم ان کی قبر سے بہت دور رہتے ہیں۔"

"فرانس میں تو دوری کا خیال نہیں کیا جاتا، وہاں ہم ضرور جایا کرینگے۔ میرا خیال ہے کہ مجھے ضرور دادا کی قبر پر فاتحہ کے لیے جانا چاہیئے۔"

"میرا خیال ہے کہ ہمیں کسی ایسی جگہ نہ رہنا چاہیئے کہ میں کبھی آپ کی موت کے بعد آپ کی قبر پر نہ جا سکوں۔"

"ہمیں اس کا انتظام کرنا پڑے گا۔"

"ہم سب کو کسی ایسی جگہ دفن ہونا چاہیئے جہاں آسانی کے ساتھ پہنچا جا سکے۔ اگر ہم سب فرانس میں دفن ہوں تو بڑی عمدہ بات رہے۔"

"میں فرانس میں دفن ہونا نہیں چاہتا" بک نے کہا۔

"بہت اچھا، تو پھر امریکہ ہی میں کوئی موزوں سی جگہ تلاش کرنی چاہیے۔ ہم سب اپنے مویشی خانے میں دفن نہیں ہو سکتے۔"

"یہ تجویز تو معقول ہے۔"

"اس طرح میں اپنے مویشی خانے کو جاتے ہوئے اپنے دادا کی قبر پر فاتحہ پڑھ لیا کروں گا۔"

"تم بڑے باعمل آدمی ہو"

"بات یہ ہے کہ مجھے اپنے دادا کی قبر پر نہ جا سکنے کا بڑا ہی افسوس ہے۔"

"وہیں جانا ہی پڑے گا" بک نے کہا "مجھے اس بات کا احساس ہو گیا ہے کہ ہمیں جانا ہی چاہیے۔"

انہوں نے کابینہ کے چھ وزراء کو ہسپتال کی دیوار کے ساتھ، صبح ساڑھے چھ بجے باڑھ مار دی۔ صحن کے گڑھوں میں پانی اکٹھا ہو رہا تھا اور فرش پر بھیگے سوکھے پتے بکھرے پڑے تھے۔ اتنے زور کی بارش ہوئی کہ ہسپتال کی کھڑکیاں اور روشندان بند کر دیئے گئے تھے۔ ایک وزیر کو میعادی بخار تھا۔ دو سپاہی اسے اٹھا کر نیچے لائے اور برستے پانی میں لے گئے۔ انہوں نے سہارا دے کر اُسے دیوار کے ساتھ کھڑا کیا۔ لیکن وہ پانی اور کیچڑ میں بیٹھ گیا۔ آخر افسر نے سپاہیوں سے کہا کہ اسے کھڑا رکھنے کی کوشش کرنا بے سود ہے۔ جب سپاہیوں نے پہلی باڑھ ماری تو وہ گھٹنوں میں سر دبائے پانی میں بیٹھا تھا۔

پہلوان

نک اٹھ کھڑا ہوا، وہ صحیح سلامت تھا۔ اُس نے ریل کی پٹڑی کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھا۔ آخری گاڑی کی بتیاں موڑ پر نظروں سے غائب ہو رہی تھیں۔ لائن کے دونوں طرف پانی کھڑا تھا۔ اور اس کے پیچھے دلدل تھی۔ اُس نے گھٹنے کو ٹٹول کر دیکھا، پتلون پھٹ چکی تھی، اور جلد اُدھڑ گئی

تھی۔ اس کے ہاتھ چھل گئے تھے اور ناخنوں میں ریت اور راکھ گھس پڑی تھی۔ ریل کی پٹڑی کے کنارے تھوڑی سی ڈھلان آتر کر اس نے بڑی توجہ سے ٹھنڈے پانی میں اپنے ہاتھ دھوئے اور ناخنوں سے مٹی نکالی۔ پھر دو زانو بیٹھ کر اس نے گھٹنا دھویا۔

پکڑے پڑیں اس بریک مین کے بچے کو کسی دن میرے ہتھے بھی چڑھا، تو اس کی خوب خبر لوں گا کیا خوب حرکت کی ہے، اس بد بخت نے، کہنے لگا اُدھر آؤ بیٹے تمہیں کچھ دُوں میں دھوکے میں آ گیا۔ اور پھر کیسی بری حرکت کی خیر آئندہ میں اس کے قابو نہ آؤں گا۔

"ادھر آؤ بیٹے تمہیں کچھ دوں" اور پھر ایک تڑاق سے رسید کی۔ اور میں گھٹنوں اور ہاتھوں کے بل پٹری پر آن رہا۔

اس نے اپنی آنکھوں کو ملا۔ جہاں ایک بڑا سا گومڑا ابھر رہا تھا۔ آنکھ کے قریب زخم بھی تھا اور اس میں درد بھی شروع ہو گیا تھا۔ "خبیث، بریک مین کا بچہ"

اُس نے آنکھ کے قریب گومڑے کو چھو کر دیکھا۔ کچھ دنوں کے لیے یہاں نشان پڑا رہے گا۔ اس سوادی میں یہ انعام ملا۔ خیر سستے ہی چھوٹے۔ کاش میں اسے دیکھ سکتا۔ پانی کے عکس میں تو نظر ہی نہیں آتا۔ ہر طرف تاریکی تھی اور دونوں طرف آبادی دور تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ پتلون سے پونچھ لیے اور ریل کی پٹری پر آ گیا۔

وہ دونوں لائنوں کے درمیان چل پڑا جس میں پتھروں کے سنگریزے اور مٹی بھری ہوئی تھی اور اس پر آسانی سے چلا جا سکتا تھا۔ دونوں طرف کی دلدل کے درمیان یہ خشک راستہ بڑا ہموار تھا۔ [illegible] ۔۔۔قدمی سے

چل دیا، کیونکہ سے کہیں نہ کہیں آبادی میں پہنچنا ہی تھا۔

والٹن جنکشن پر جب مال گاڑی ہلکی ہوئی تو نِک اس پر چڑھ گیا تھا۔ تاریکی ہوتے ہوتے گاڑی کلکاسکہ سے گزری۔ اس حساب سے اسے مانسیلونا کے قریب ہونا چاہیئے۔ ابھی تین چار میل اور دلدل ہوگی، وہ دونوں لائنوں کے درمیان پتھروں پر چل رہا تھا جب وہ دائیں بائیں دیکھتا دونوں طرف دلدل کا بھوت بلند ہوتا ہوا معلوم دیتا تھا۔ وہ میل پر میل طے کرتا چلا گیا۔ لیکن دلدل یونہی اس کے دونوں طرف موجود رہی۔

سامنے ایک پل نظر آیا، جسے عبور کرتے ہوئے نک کے بوٹ سے لوہے میں گونج پیدا ہوتی تھی۔ لوہے کے بند حصوں کے درمیان جھانکنے سے پانی سیاہ نظر آتا تھا۔ اس نے ایک اکھڑی ہوئی میخ کو ٹھوکر ماری تو وہ نیچے پانی میں جا گری۔ پل سے پرے پہاڑیاں تھیں۔ اب ریل کی پٹری کے دائیں اور بائیں دونوں طرف زمین اونچی اور تاریک نظر آتی تھی سامنے ایک جگہ آگ جلتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ پٹری احتیاط سے چلتا ہوا آگ کی طرف آیا جو ریلوے کے بند کے نیچے ایک طرف کو جل رہی تھی۔ اسے صرف آگ کی روشنی نظر آ رہی تھی۔ ایک موڑ مڑ کر آگ نظر پڑی۔ اور یہاں جگہ ہموار اور کھلی تھی۔ اور اس سے آگے جنگل شروع ہوتا تھا۔ نک بند پھلانگ کر درختوں میں سے ہوتا ہوا آگ کی طرف آیا۔ یہ جنگل سفیدے کا تھا جس کا ٹپکا ہوا چھلکا نک کے پاؤں تلے روندا جا رہا تھا، جنگل کے کنارے الاؤ روشن تھا اور ایک آدمی اس کے پاس بیٹھا تھا۔ نک ایک درخت کی اوٹ میں کھڑا کچھ دیر دیکھتا رہا۔ وہ آدمی اکیلا ہی معلوم ہوتا تھا، اور اپنے سر کو ہاتھوں میں تھامے آگ کی طرف ٹکٹکی لگائے بیٹھا تھا۔ نک

آگے بڑھ کر آگ کی روشنی میں آگیا۔

یہ آدمی اسی طرح آگ کی طرف دیکھتا رہا۔ نک اس کے قریب بھی پہنچ گیا۔ لیکن اس نے سر نہ اٹھایا۔

"ہیلو!" نک نے کہا۔

اس آدمی نے سر اُٹھا کر دیکھا اور بولا "یہ گھٹا کہاں سے لیا؟"

"ایک بریک مین نے نوازش کی ہے۔"

"مال گاڑی والے نے؟"

"ہاں"

"اس حرامی کو میں نے ابھی دیکھا تھا۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹہ ہوا ہے گاڑی یہاں سے گزری تھی۔ وہ گاڑی میں ٹہلتا ہوا گا رہا تھا اور اپنے بازوؤں پر طبلہ بجا رہا تھا۔

"حرامی کتّا۔"

تمہیں مار کر شاید وہ لطف اٹھا رہا تھا" اس نے بڑی متانت سے کہا۔

"میں بھی کسی وقت بدلہ لے لوں گا"

"پھر کبھی اسے دیکھنے کا اتفاق ہو تو پھر پتھر مار کے اس کا سر پھوڑ دینا" اس نے مشورہ دیا۔

"میں اس کی خبر لے کر چھوڑوں گا"

"تم کافی مضبوط ہو ناں"

"کچھ بھی نہیں" نک نے جواب دیا۔

"تمہاری جنس سب مضبوط اور جفاکش ہے"

"ہاں جفاکش تو بننا ہی پڑتا ہے"

"میرا بھی یہی مطلب ہے"

وُہ نِک کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ آگ کی روشنی میں نِک نے دیکھا کہ اس کی شکل وصورت بگڑی ہوئی ہے۔ اس کی ناک دبی ہوئی تھی، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئیں اور ہونٹ عجیب وغریب طور پر کٹے پھٹے، نِک کو یہ تفصیل تو یک دم معلوم نہ ہوئی۔ لیکن اس نے یہ محسوس کیا کہ اس کی شکل عجیب طرح کی قطع وبرید سے مسخ ہو رہی ہے۔ یوں معلوم ہوتا تھا، جیسے پوٹین کے سلیے ڈول پیڑے پر کسی نے رنگ دے دیا ہے۔ آگ کی روشنی میں وُہ کسی لاش کا چہرہ معلوم ہوتا تھا۔

"تمہیں میرا حسین چہرہ شاید پسند نہیں؟"

نِک گھبرا سا گیا کہ کیا جواب دے۔

"ٹھیک ہے"

"یہ بھی دیکھو" اُس نے اپنا سر ننگا کرتے ہوئے کہا۔

اس کا صرف ایک ہی کان تھا اور وُہ بھی سُوجا ہُوا، اور سر کے ساتھ ملا ہُوا۔ اور دوسرے کان کی جگہ صرف ایک ٹھنٹھ سا تھا۔

"کبھی ایسا کان بھی دیکھا ہے؟"

"نہیں" نِک نے کہا۔ اس کا دِل ڈوبنے لگا۔

"میں نے ایسی ایسی چوٹیں بھی برداشت کی ہیں، کیا خیال ہے تمہارا؟"

"کیوں نہیں"

"وہ سب مجھ پر ٹوٹ پڑے" اُس چھوٹے سے قد کے آدمی نے کہا "وہ میرا کچھ بھی نہ بگاڑ سکے۔ بیٹھ جاؤ" اس نے نِک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "کچھ کھاؤ گے؟"

"آپ تکلیف نہ کریں۔" نک نے جواب دیا۔ "میں شہر کی طرف جا رہا ہوں۔"

"سنو" پیٹھے آدمی نے پھر کہا۔ "میرا نام ایڈ ہے۔"

"بہت خوب۔"

"اور سنو، میں تندرست نہیں ہوں"

"کیوں کیا بات ہے؟"

"میں نیم پاگل ہوں"

اُس نے ٹوپی پھر سر پر رکھ لی۔ نک نے ہنسی کو بمشکل دباتے ہوئے کہا "آپ تو بالکل ٹھیک ہیں۔"

"نہیں، میں ٹھیک نہیں ہوں۔ میں پاگل ہوں سنو تم بھی کبھی پاگل ہوئے ہو کہ نہیں؟"

"میں تو کبھی پاگل نہیں ہوا" نک نے جواب دیا۔ "یہ عارضہ آپ کو کیسے ہوا؟"

"معلوم نہیں" ایڈ نے کہا "بات یہ ہے کہ جب دیوانگی آتی ہے تو اس کے متعلق کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ تم مجھے جانتے ہو؟"

"افسوس ہے۔ میں آپ سے واقف نہیں۔"

"میں ایڈ فرانسس ہوں"

"خدا کی قسم؟"

"تمہیں یقین نہیں آتا؟"

"سمجھ گیا" نک کو یقین آگیا۔

"تمہیں معلوم ہے میں اپنے حریفوں کو کس طرح مارتا رہا ہوں؟"

"نہیں تو" نک نے کہا۔

"میری نبض کی رفتار کم ہو گئی ہے۔ ایک منٹ میں صرف چالیس ضربیں۔ نبض پر ہاتھ رکھ کے دیکھو۔"

نک ذرا ہچکچایا۔

"اِدھر آؤ" اس نے نک کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا "میری کلائی پکڑو۔ اور اس جگہ اپنی انگلیاں رکھو"

ایڈ کی کلائی چوڑی تھی اور ہڈی کے اُوپر موٹے موٹے پٹھے ابھرے ہوئے تھے۔ نک نے اس کی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی نبض محسوس کی۔

"گھڑی ہے؟"

"نہیں"

"میرے پاس بھی نہیں" ایڈ نے کہا۔ "گھڑی ہی نہیں تو پھر دیکھنے سے کیا فائدہ" نک نے اس کی کلائی چھوڑ دی۔

"سنو" ایڈ فرانسس نے کہا "کلائی پھر پکڑو۔ تم نبض کی ضربیں گنو اور میں ساٹھ تک گنوں گا"

نک نے اپنی انگلی کے نیچے نبض کی زوردار ضربیں محسوس کیں اور انہیں گننے لگا۔ ایڈ مدھم آواز میں ایک، دو، تین، چار، پانچ آہستہ آہستہ گنتا گیا "ساٹھ" ایڈ نے ختم کرتے ہوئے کہا "ایک منٹ ہو گیا کتنی ضربیں ہوئیں؟"

"چالیس" نک نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے" ایڈ نے مسرت سے کہا "یہ اس سے زیادہ تیز کبھی نہیں چلتی"

ایک آدمی ریلوے کا بند پھلانگ کر کھلی جگہ   طے کرتا ہوا آگ کی طرف آ رہا تھا۔

"ہیلو، بگز" ایڈ نے پکارا۔

"ہیلو" بگز نے جواباً کہا۔ یہ ایک نیگرو کی آواز تھی۔ نک کو اس کی چال سے ہی معلوم ہو گیا کہ وہ نیگرو ہے۔ وہ انکی طرف پیٹھ کئے۔ آگ پر جھک گیا اور پھر سیدھا کھڑا ہو گیا۔

"یہ میرا ساتھی بگز ہے" ایڈ نے تعارف کراتے ہوئے کہا۔ "یہ بھی میری طرح پاگل ہے"

"آپ سے مل کر خوشی ہوئی" بگز نے کہا "آپ کہاں سے آرہے ہیں؟"

"شکاگو سے" نک نے جواب دیا۔

"بڑا نفیس شہر ہے" نیگرو نے کہا۔ "میں آپ کا نام نہیں سن سکا"

"میرا نام ایڈمز ہے۔ نک ایڈمز"

"بگز، یہ کہتا ہے کہ میں کبھی پاگل نہیں ہوا" ایڈ نے کہا۔

"ابھی اسے کئی تجربے ہونے والے ہیں" نیگرو نے کہا۔ وہ آگ کے پاس کھڑا کاغذ میں لپٹی ہوئی کوئی چیز کھول رہا تھا۔

"ہم کھانا کب کھائیں گے بگز؟" نامی پہلوان نے پوچھا۔

"ابھی لو"

"تم بھی بھوکے ہو نک؟"

"پیٹ کا دوزخ جہنم کی طرح بھڑک رہا ہے"

"سن رہے ہو بگز؟"

"ہاں، میرا سب طرف دھیان ہے"

"میں نے یہ تو نہیں پوچھا تھا"

"ہاں، جو کچھ ان صاحب نے کہا ہے، میں نے سن لیا ہے"

اُس نے گوشت کے قتلے لے کے توے پر ڈال دیے جن میں چربی پگھل کر بیوسشش کھانے لگی۔ بگز لمبی ٹانگوں کے ساتھ جھکا، آج یہ انڈے توڑ توڑ کر ڈالنے لگا۔ اور پھر انہیں ادھر ادھر ہلا کر گرم گرم چربی میں تلنے لگا۔

"مسٹر ایڈمز، اس تھیلے میں سے روٹی نکال کر ذرا کاٹ دیجئے۔" بگز نے آگ پر سے مڑتے ہوئے کہا۔

"بہت بہتر"

نک نے تھیلے میں سے روٹی نکال کر اس کے چھ ٹکڑے کاٹے، ایڈ آگے کو جھکا ہوا بڑے غور سے اس طرف دیکھ رہا تھا۔

"ذرا چاقو دکھانا نک" اس نے کہا۔

"ہرگز نہیں" نیگرو بول اُٹھا۔ "مسٹر ایڈمز اپنے چاقو نہ دینا"۔ پہلوان سیدھا ہو بیٹھا

"روٹی ادھر لے آیئے مسٹر ایڈمز" بگز نے کہا۔ نک روٹی اس کے پاس لے گیا۔

"چربی میں ڈوبی ہوئی روٹی آپ کو پسند ہے؟" نیگر نے پوچھا۔

"بے حد پسند ہے!"

"اچھا اسے اخیر میں کھائیں گے۔ کھانے کے آخر میں زیادہ لطف آئے گا۔ یہ لیجئے" نیگرو نے گوشت کا ایک قتلہ روٹی کے ٹکڑے پر رکھ دیا۔ اور اس کے اوپر تلا ہوا انڈا رکھا۔

"اسے پلیٹ کر سینڈوچ بنا لیجئے۔ اور مسٹر فرانسس کو دیدیجئے۔" ایڈ نے سینڈوچ لے کر کھانا شروع کر دیا۔

"ذرا خیال رکھیے۔ انڈا بہہ نہ جائے" نیگرو نے احتیاطاً کہہ دیا "آپ کے لیے ہے مسٹر ایڈ مز۔ اور باقی میرے لیے"
نک نے اپنے سینڈوچ سے لقمہ کاٹا۔ نیگرو اس کے سامنے ایڈ کے پہلو میں بیٹھا ہوا تھا۔ تلا ہوا گوشت اور انڈا کتنا لذیذ تھا۔
"مسٹر ایڈ مز کو خوب بھوک لگ رہی تھی" نیگرو نے کہا جیب سے نیگرو نے چاقو والی بات کہی تھی، پہلوان بالکل خاموش ہو گیا تھا۔
"مسٹر نک، گرم گرم چربی میں روٹی کا ٹکڑا بھگو کر آپ کو دوں؟" بگز نے پوچھا۔
"مہربانی آپ کی"
پہلوان نے نک کی طرف نظر بھر کر دیکھا۔
"مسٹر ایڈ ولف فرانسس آپ بھی لیں گے؟" بگز نے توسے کے پاس بیٹھے ہوئے پوچھا، ایڈ خاموش رہا اور نک کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔
"مسٹر فرانسس؟" نیگرو نے بڑی ملائم آواز میں کہا۔
ایڈ اب بھی خاموش رہا اور نک پہ نظریں گاڑے دیکھتا رہا۔
"میں آپ سے پوچھ رہا ہوں مسٹر فرانسس؟" نیگرو نے پھر بڑی نرم آواز میں کہا۔ ایڈ ٹکٹکی باندھے نک کی طرف دیکھتا رہا۔ اس نے ٹوپی اپنی آنکھوں پہ کھینچ لی تھی۔ نک گھبرا گیا۔
"تمہیں یہ ضلالت کیسے ہوئی جرأت ہوئی کیسے؟" اس نے نک کی طرف دیکھتے ہوئے غصے سے کہا۔
"تم اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہو گستاخ حرامی پلّے۔ تم بن بلائے دوسرے دل

دکھا نا دکھا سکتے ہو اور جب کوئی شریف آدمی تم سے چاقو مانگے تو نہایت گستاخی سے انکار کر دیتے ہو۔"

اس کا چہرہ فرطِ غیظ سے سرخ ہو رہا تھا اور اس کی آنکھیں نیلی ٹوپی کے عقب میں چھپی ہوئی تھیں۔

"ہڈیوں کے دوزخی ڈھانچے! تمہیں کہا کس نے تھا کہ یہاں آ کر خواہ مخواہ اپنی ناک گھسیڑ دو۔"

"کسی نے بھی نہیں!"

"ہاں تمہاری یہ بکواس بالکل صحیح ہے کہ تمہیں کسی نے بھی نہیں بلایا تھا۔ اور تمہیں یہاں ٹھہرنے کے لیے بھی کسی نے نہیں کہا۔ مگر یہاں خواہ مخواہ آن ٹپکے اور پھر میرے سگار اور میری شراب پی کر میرے چہرے کا تمسخر اڑاتے رہے اور گستاخانہ باتیں کرتے رہے۔ اب کس جہنم میں جانے کا تمہارا ارادہ ہے؟"

نک خاموش رہا۔ ایڈ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"میں تمہیں بتاتا ہوں۔ تنگا گو کے نامرد حرامی۔ تمہاری کھوپڑی توڑ کر تمہارا بھیجہ نکال دوں گا۔ سمجھے؟"

پہلوان آہستہ آہستہ بائیں قدم بڑھاتے اور دائیں کو گھسیٹتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ نک پیچھے ہٹ گیا۔

"وار کرو۔" اس نے اپنے سر کو ہلا کر کہا۔ "مرد بن۔ وار کرو۔"

"میں تم پر وار نہیں کرنا چاہتا۔"

"تم اس طرح نہ مانو گے۔ تم صرف پٹنا چاہتے ہو۔ آؤ اور پہل کرو۔"

"چھوڑو بھی اس بات کو۔" نک نے کہا۔

"لو پھر حرامی بچے!"

پہلوان کی نظر نک کے پاؤں پر پڑی جونہی اُس کی نظر نیچی ہوئی نیگرو نے جو اس کے پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا، اس کے سر کے نیچے کوئی چیز دے ماری پہلوان منہ کے بل گھاس میں گرا اور رنگ دار کپڑے میں لپٹی ہوئی شراب کی کپی گھاس پر گرا دی۔ نیگرو نے اسے اٹھایا تو اس کا سر لٹک رہا تھا۔ وہ اسے آگ کے پاس لے آیا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں، اور چہرہ خوفناک نظر آ رہا تھا۔

"مسٹر ایڈمز، بالٹی میں تھوڑا سا پانی لے آیئے" نیگرو نے کہا "میں نے شاید اسے زیادہ زور سے چوٹ لگا دی ہے۔"

نیگرو نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کے پانی کے چھینٹے دیئے اور پھر آہستہ سے اس کے کان کھینچے، اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

نک اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"سب ٹھیک ہے، کوئی فکر کی بات نہیں" اس نے کہا "مسٹر ایڈمز مجھے اس کی باتوں کا بے حد افسوس ہے۔ امید ہے آپ معاف فرمائیں گے۔"

"کوئی مضائقہ نہیں" نک زمین پر پڑے ہوئے پہلوان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے زمین پر کپی پڑی ہوئی دیکھی اور اسے اٹھا لیا۔ اس کا دستہ لچک دار تھا۔ یہ پرانے کالے چمڑے کی بنی ہوئی تھی۔ اور اس کے بھاری حصے پر رومال لپٹا ہوا تھا۔

"یہ دستہ وھیل مچھلی کی ہڈی کا بنا ہوا ہے۔ آج کل اس قسم کے دستے نہیں بنتے۔" نیگرو نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ اپنا بچاؤ کر سکیں گے یا نہیں اور اس کے علاوہ میں یہ بھی نہ چاہتا تھا کہ

اس کی موجودہ چوٹوں پر کسی اور چوٹ کا اضافہ ہو۔"

نیگرو مسکرایا۔

"لیکن اسے تم نے خود مارا ہے۔"

"مجھے اس کا طریقہ معلوم ہے، جب یہ ہوش میں آئے گا تو اسے کچھ بھی یاد نہ رہے گا۔ جب اس پہ دیوانگی کا دورہ پڑتا ہے تو مجھے مجبوراً یہ عمل کرنا ہی پڑتا ہے۔"

نک ابھی تک اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ آگ کے پاس پڑا ہوا تھا اور اس کی آنکھیں بند تھیں۔ نیگرو نے کچھ اور لکڑیاں آگ میں جھونک دیں۔

"آپ اس کے لیے فکرمند نہ ہوں، مسٹر ایڈمز۔ میں کئی دفعہ اسے اس حالت میں دیکھ چکا ہوں۔"

"یہ دیوانہ کیسے ہو گیا؟" نک نے پوچھا۔

"اس کی بہت سی وجوہات ہیں" نیگرو نے الاؤ کے پاس سے جواب دیا۔

"آپ کافی کا ایک پیالہ پئیں گے مسٹر ایڈمز؟"

اس نے کافی کا پیالہ نک کے ہاتھ میں دے دیا اور پھر اس کوٹ کی تہوں کو درست کرنے لگا۔ جو اس نے بیہوش آدمی کے سر کے نیچے رکھا ہوا تھا۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ اس نے بہت زیادہ مار کھائی ہے۔" نیگرو نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ "لیکن اس سے وہ پاگل نہ ہوا تھا۔ صرف ذرا بیوقوف سا ہو گیا۔ اس وقت اس کی بہن اس کی مینیجر تھی اور

اخباروں میں اس بات کا بڑا چرچا تھا۔ کہ بھائی اپنی بہن سے کتنی محبت کرتا ہے اور بہن اپنے بھائی پر کتنی فدا ہے۔ لیکن اس کے بعد نیویارک میں ان دونوں نے شادی کر لی۔ اس سے بہت سی ناخوشگوار باتیں پیدا ہوئیں"

"مجھے بھی یہ واقعہ یاد ہے۔"

"ضرور یاد ہوگا، کیونکہ اس کا بڑا چرچا ہوا تھا، لیکن حقیقت میں یہ بہن بھائی نہ تھے۔ لوگوں کو یہ بات بھی پسند نہ تھی کہ وہ بہن بھائی ہوں اور یہ بھی پسند نہ تھا کہ وہ بہن بھائی ثابت نہ ہوں۔ اس بات پر بڑی لے دے ہوئی چنانچہ ایک دن وہ یکایک غائب ہو گئی، اور پھر کبھی واپس نہ آئی۔"

اس نے کافی کا ایک اور گھونٹ لیا، اور پھر اپنی پیازی رنگ کی ہتھیلی سے اپنے ہونٹ پونچھے۔

"بس اس روز سے یہ پاگل ہو گیا، آپ اور کافی لیں گے مسٹر ایڈمز؟"

"شکریہ۔"

"میں اسے دو مرتبہ ملا ہوں۔" نیگرو نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "وہ بڑی ہی حسین عورت تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے وہ دونوں جڑواں ہیں۔ اگر اس کا چہرہ یوں مسخ نہ ہوا ہوتا تو تم دیکھتے یہ کتنا خوبصورت ہے۔"

وہ چپ ہو گیا۔ شاید ساری کہانی ختم ہو چکی تھی۔

"تمہارے ساتھ اس کے تعلقات کیسے پیدا ہو گئے؟" نِک نے پوچھا۔

"مجھ سے اس کی ملاقات جیل میں ہوئی تھی۔" نیگرو نے بتایا۔ "جب سے وہ گم ہوئی یہ ہر کسی کے ساتھ لڑ پڑتا تھا، چنانچہ اسے قید کر دیا گیا۔ میں بھی وہاں ایک قتل کے سلسلے میں محبوس تھا۔"

وہ مسکرایا اور پھر بڑی نرم آواز میں بولا۔ "میں اسے دیکھتے ہی اس کا

شیدا ہو گیا۔ اور جب جیل سے میری مخلصی ہوئی تو میں نے اُسے ڈھونڈ نکالا۔ یہ مجھے بھی دیوانہ سمجھتا ہے۔ اور اس بات پر بڑا خوش ہے کہ ہم دونوں دیوانے ہیں۔ مجھے بھی اس کی رفاقت بڑی پسند ہے اور یہیں ملک کی سیر بھی کرنا چاہتا ہوں۔ اور اس کے لیے مجھے چوری بھی نہیں کرنی پڑتی۔ شریف لوگوں کی طرح زندگی بسر کرنا مجھے بڑا پسند ہے۔"

"تم دونوں کام کیا کرتے ہو؟" نک نے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں بس صرف گھومتے رہتے ہیں۔ اس کے پاس روپیہ بھی ہے۔"

"اس نے تو کافی دولت کمائی ہوئی ہو گی؟"

"بے شک، لیکن یہ اپنی ساری دولت خرچ کر چکا ہے۔ یا یہ سمجھئے کہ اس سے چھین لی گئی ہے۔ اب وہ لڑکی اس کا خرچ بھیجتی ہے۔"

اس نے لکڑیاں ہلا کر آگ کو تیز کیا۔

"وہ بڑی اچھی عورت ہے۔ اِن کی شکل و صورت اتنی ملتی جلتی ہے، جیسے یہ دونوں جڑواں ہوں۔"

نیگرو نے لیٹے ہوئے آدمی کی طرف دیکھا جو گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ اُس کے سنہرے بال اُس کی پیشانی پر بکھرے پڑے تھے۔ اس کا مسخ شدہ چہرہ یوں نظر آتا تھا جیسے کسی بچے کا ہو۔

"اب میں جس وقت بھی چاہوں اسے ہوش میں لا سکتا ہوں۔ اگر آپ مضائقہ نہ سمجھیں تو میرے خیال میں اب آپ چلے ہی جائیں۔ مہمان نوازی اس بات کی اجازت تو نہیں دیتی۔ لیکن یہ آپ کو دوبارہ نہ دیکھے تو اچھا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اُسے پھر کوئی تکلیف دُوں لیکن جب اسے دَورہ پڑتا ہے تو

سوائے اس کے اور کوئی چارہ ہی نہیں رہتا۔ میں اسے لوگوں سے دُور دُور ہی رکھتا ہوں۔ آپ بُرا تو نہ مانیں گے مسٹر ایڈمز؟ نہیں شکریے کی کوئی بات نہیں مسٹر ایڈمز۔ میں آپ کو پہلے ہی سے خبردار کر دیتا، لیکن مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ آپ سے کچھ مانوس سا ہو گیا ہے۔ اس لیے میں خاموش رہا۔ آپ ریل کی پٹری پر چلے جائیں، کوئی دو میل کے فاصلے پر شہر ہے۔ اس کا نام مانسیلونا ہے۔ اچھا خدا حافظ۔ میں چاہتا تھا کہ آپ رات یہیں گزار لیتے، لیکن اب اس کا کوئی امکان ہی نہیں رہا۔ آپ تھوڑا سا گوشت اور روٹی اپنے ساتھ لے جائیں۔ انکار نہ کیجئے۔ اچھا ایک سینڈوچ ہی لے جائیے۔" یہ سب باتیں اُس نے بڑی ملائم اور مدھم آواز میں کہیں، جیسا کہ عام طور پر نیگرو کرتے ہیں۔

"بس ٹھیک ہے۔ اچھا خدا حافظ، مسٹر ایڈمز، خدا حافظ، خوش بختی آپ کا ساتھ دے!"

نِک میدان قطع کر کے ریل کی پٹڑی کی طرف چل پڑا۔ آگ کی روشنی سے نکلتے ہوئے اس نے نیگرو کے آہستہ آہستہ بولنے کی آواز سُنی۔ نِک نے نیگرو کے الفاظ نہ سُنے، پھر پہلوان کی آواز آئی، "مجھے بڑا شدید درد ہے بگز!"

"ابھی ٹھیک ہو جاؤ گے فرانسس۔ لو گرم گرم کافی کا ایک پیالہ پی لو!"

نِک بند پر چڑھ کر ریلوے کی پٹڑی پر آ گیا۔ اُسے خیال آیا کہ اُس کے ہاتھ میں سینڈوچ پکڑا ہوا ہے۔ اس نے سینڈوچ جیب میں رکھ لیا۔ پہاڑی کے موڑ پر پہنچ کر اس نے ایک دفعہ پھر مُڑ کر دیکھا، میدان میں ابھی تک آگ جل رہی تھی۔

قاتل

ہنری کے ہوٹل کا دروازہ کھُلا اور دو آدمی اندر داخل ہوئے اور کاؤنٹر پر آکر بیٹھ گئے۔

"آپ کو کیا چاہیئے؟" جارج نے اُن سے پوچھا۔

"معلوم نہیں" آل نے کہا۔ "سمجھ میں نہیں آتا میں کیا کھانا چاہتا ہوں"

باہر تاریکی پھیلتی جا رہی تھی پھر کھڑکی کے باہر سڑک کی بتیاں روشن ہو گئیں۔ کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے دونوں آدمیوں نے کھانے کی فہرست پڑھی۔ کاؤنٹر کے دوسرے سرے سے نِک ایڈمز انہیں تاک رہا تھا جب یہ لوگ داخل ہوئے تو وہ جارج سے باتیں کر رہا تھا۔

"بھُنا ہوا گوشت، ایپل پائی اور آلو" پہلے آدمی نے کہا۔

"یہ تو ابھی تیار نہیں ہوا"

"تو پھر تم نے اسے فہرست میں لکھنے کی جرأت کیسے کی ہے؟"

"یہ رات کے کھانے میں درج ہے" جارج نے بتایا۔ "چھ بجے کے بعد

آپ کو مل سکتا ہے۔"

جارج نے کاؤنٹر کے پیچھے لٹکی ہوئی گھڑی کو دیکھا۔

"ابھی تو پانچ بجے ہیں۔"

"گھڑی میں تو پانچ بجکر بیس منٹ ہوئے ہیں۔"

"یہ بیس منٹ آگے ہے۔"

"جہنم میں ڈالو اس گھڑی کو۔" پہلے آدمی نے کہا "تمہارے پاس تیار کیا ہے۔؟"

"آپ کو سینڈوچ ہر قسم کے مل سکتے ہیں۔" جارج نے کہا۔ "سوکھا گوشت اور انڈے مل سکتے ہیں۔ نمکین گوشت اور انڈے۔"

"اچھا مجھے بھُنی ہوئی مُرغی سبز مٹروں کے ساتھ، کریم اور آلو دیدو۔"

"یہ رات کے کھانے میں ملے گا۔"

"جو چیز بھی ہم مانگتے ہیں وہ رات کے کھانے کی ہوتی ہے۔ اچھا ہوٹل چلا رہے ہو تم۔"

"میں آپ کو سوکھا گوشت اور انڈے، نمکین گوشت اور انڈے......"

"اچھا نمکین گوشت اور انڈے لاؤ۔" اس آدمی نے کہا جس کا نام آل تھا۔ اس نے ایک ڈربی ہیٹ اور کالا اوورکوٹ پہنا ہوا تھا جس کے بٹن چھاتی پر سے بند تھے۔ اُس کا چہرہ چھوٹا سا، رنگ سفید اور ہونٹ پتلے پتلے تھے۔ اس نے ایک ریشمی گلوبند اور دستانے بھی پہن رکھے تھے۔

"مجھے سوکھا گوشت اور انڈے دیدو۔" دوسرے آدمی نے کہا۔ اس کا قد آل جتنا ہی تھا۔ اُن کی صورتیں تو الگ الگ تھیں لیکن لباس بالکل ایک جیسا پہن رکھا تھا۔ دونوں کے اوورکوٹ بڑے چُست تھے۔ وہ آگے کو جھکے

ہوئے کہنیوں کو کاؤنٹر پر ٹیک کر بیٹھے ہوئے تھے۔

"پینے کے لیے بھی کچھ ہے ؟" آل نے پوچھا۔

"بیر، بیوو اور جنجرایل "

"میرا مطلب پینے سے ہے۔ پینے کے لیے کچھ ہے کہ نہیں "

"وہی کچھ جو میں نے بتایا ہے "

"یہ تو بڑا گرم شہر معلوم ہوتا ہے۔ کیا نام ہے اس کا ؟"

"سمٹ "

"یہ نام کبھی سنا ہے ؟" آل نے اپنے دوست سے پوچھا۔

"کبھی نہیں " اس کے دوست نے جواب دیا۔

"تم لوگ راتوں کو یہاں کیا کرتے ہو ؟"

"لوگ کھانا کھانے آتے ہیں " اس کے دوست نے کہا "سب لوگ یہی شاندار دعوت کھاتے ہیں "

"ہاں بالکل ٹھیک ہے " جارج نے کہا۔

"تم اسے ٹھیک کہتے ہو ؟"

"بے شک "

"بڑے استاد بنتے ہو۔ کیوں ؟"

"بے شک " جارج نے پھر کہا۔

"خاک بھی نہیں " چھوٹے نے کہا "کیوں آل تمہارا کیا خیال ہے ؟"

"یہ گونگا ہے " آل نے کہا۔ پھر نِک کی طرف مڑ کر بولا "تمہارا کیا نام ہے ؟"

"ایڈمز "

"یہ ایک اور اُستاد ہے۔" آل نے کہا۔ "کیوں میکس، ہے کہ نہیں؟"
"یہ سارا شہر اُستادوں سے بھرا پڑا ہے۔" میکس نے جواب دیا۔
جارج نے دو پلیٹیں جن میں سے ایک میں سؤر کا گوشت اور انڈا تھا۔
اور دوسری میں نمکین گوشت اور انڈے، کاؤنٹر پہ رکھ دیں۔ اس نے آلوؤں کے بھرتے کی دو پلیٹیں بھی رکھ دیں۔ اور باورچی خانے کی کھڑکی بند کر دی
"تمہارا کون سا کھانا ہے؟" اُس نے آل سے پوچھا۔
تمہیں یاد نہیں؟"
نمکین گوشت اور انڈے۔"
"تم بھی بڑے استاد ہو۔" میکس نے کہا۔ اس نے آگے کو جھک کر سؤر کا گوشت اور انڈے اُٹھا لیے۔ دونوں نے اپنے دستانے اتارے بغیر کھانا شروع کر دیا۔ جارج انہیں کھاتے ہوئے دیکھتا رہا۔
"تم کیا دیکھ رہے ہو؟" میکس نے جارج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"کچھ بھی نہیں۔"
"جھوٹ کہتے ہو، تم مجھے کیوں گھور رہے تھے۔"
"ممکن ہے یہ لونڈا دل لگی کر رہا ہو میکس۔" آل نے کہا۔
جارج ہنس پڑا۔
"دانت کیوں نکال رہے ہو۔" میکس نے غصے سے کہا۔ "دانت نکالنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یاد رکھو۔"
"بہت اچھا۔" جارج نے کہا۔
"اس کا خیال ہے کہ یہ بہت اچھی بات ہے۔" میکس نے آل کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔ "یہ اس میں کوئی مضائقہ ہی نہیں سمجھتا۔ بڑا اچھا آدمی ہے۔"

"ہاں جی! ضرور ہے" آل نے کہا۔ اور پھر دونوں کھانے میں مصروف ہو گئے۔

"اس اُستاد کا کیا نام ہے جو کاؤنٹر کے اُس سرے پر کھڑا ہے؟" آل نے میکس سے پوچھا۔

"ارے اُستاد!" میکس نے نِک کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "تم کاؤنٹر کے دوسری طرف اپنے دوست کے پاس جا کر کھڑے ہو جاؤ۔"

"تمہارا مطلب کیا ہے؟" نِک نے پوچھا۔

"مطلب وطلب کوئی نہیں"

"تم اُس طرف چلے جاؤ، اُستاد" آل نے کہا۔ نِک کاؤنٹر کے پیچھے چلا گیا۔

"مطلب کیا ہے؟" جارج نے پوچھا۔

"مطلب سے تمہارا کوئی سروکار نہیں ہے" آل نے کہا۔ "باورچی خانے میں کون ہے؟"

"نیگرو۔"

"نیگرو کون؟"

"نیگرو جو یہاں کھانے پکاتا ہے۔"

"اسے یہاں بلاؤ۔"

"تمہارا مطلب کیا ہے؟"

"اسے یہاں بلاؤ۔"

"تم کہاں کھڑے ہو، تمہیں معلوم بھی ہے۔"

"تم اس کی فکر نہ کرو ہمیں سب کچھ معلوم ہے؟" میکس نے کہا۔ کیا
ہمارے بیرے سے ملاقات ٹھیک رہی ہے؟"

"تم واقعی احمقانہ بات کر رہے ہو۔" آل نے کہا۔ "تم بحث کیوں کر
رہے ہو، خیر" اس نے جارج سے کہا "نیگرو کو یہاں بلاؤ۔"

"اس سے تمہارا کیا کام ہے؟"

کچھ بھی نہیں" "لیکن ذرا اپنے دماغ پہ زور ڈالو، استاد، حبشی سے
کیا کام ہو سکتا ہے"

"جارج نے باورچی خانے کی کھڑکی کھول کر آواز دی "سام، ذرا ادھر آنا"
باورچی خانے کا دروازہ کھلا اور نیگرو اندر آ گیا۔ "کیا بات ہے" اس نے
پوچھا۔ کاؤنٹر پہ سے دونوں آدمیوں نے اس کا جائزہ لیا۔

"دیکھو کالے! تم اس جگہ کھڑے ہو جاؤ" آل نے کہا۔

سام جس نے باورچیوں کا پیش بند باندھا ہوا تھا۔ ان دونوں آدمیوں کی طرف
دیکھنے لگا۔ جو کاؤنٹر پہ بیٹھے تھے "کیا حکم ہے صاحب" آل اپنے سٹول سے
نیچے اتر آیا۔

"دیکھو، میں اس استاد اور نیگرو کو لے کر باورچی خانے میں جا رہا ہوں"
اس نے کہا۔ "چلو کالے واپس باورچی خانے میں چلو۔ تم استاد، تم اس کے
ساتھ جاؤ" چھوٹے قد کا آدمی نک اور سام کے ساتھ باورچی خانے میں چلا گیا۔
اور دروازہ بند کر لیا گیا۔ میکس جارج کے سامنے کاؤنٹر پہ بیٹھا رہا۔ وہ
جارج کی طرف دیکھنے کے بجائے اس آئینے میں دیکھ رہا تھا جو کاؤنٹر کے
پیچھے سادی دیوار میں لگا ہوا تھا۔ یہ آئینے پہلے کرانے دار سے لگائے ہوئے
تھے، جو حجام کا کام کرتا تھا۔

"دیکھو استاد!" میکس نے آئینے پر نظریں جمائے ہوئے کہا "تم کوئی بات کیوں نہیں کرتے"۔

"یہ تو بتاؤ کہ تم آخر کر کیا رہے ہو؟"

"سنو آل!" میکس نے پکار کر کہا۔ "یہ اُستاد پوچھتا ہے کہ تم آخر کر کیا رہے ہو"؟

"تو پھر تم اسے بتاتے کیوں نہیں؟ آل کی آواز باورچی خانے سے آئی۔

"تمہیں بتا دوں نا، کہ ہم کیا کر رہے ہیں"؟

"مجھے تو خود معلوم نہیں"۔

"تمہارا خیال کیا ہے؟"

میکس کی نظریں باتیں کرتے ہوئے بھی آئینے پر جمی ہوئی تھیں۔

"میری تو سمجھ میں نہیں آتا"۔

"آل یہ اُستاد کہتا ہے کہ میری سمجھ میں نہیں آتا"۔

"میں نے تمہاری بات سُن لی ہے"۔ آل نے باورچی خانے سے کہا پھر باورچی خانے کی کھڑکی کھول کر اور جارج کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ "دیکھو اُستاد ذرا پرے کو ہو کر کھڑے ہو جاؤ۔ اور میکس تم ذرا بائیں طرف کو ہٹ جاؤ۔" وہ اس طرح ہدایات دے رہا تھا۔ جیسے کوئی فوٹوگرافر کسی گروہ کی تصویر لیتے وقت ہدایات دیتا ہے۔

"میرے ساتھ بات تو کرو استاد، بھلا بتاؤ، اب کیا ہونے والا ہے؟"

جارج خاموش کھڑا رہا۔

"آؤ اب میں تمہیں بتاتا ہوں" میکس نے کہا۔ "ہم سویڈن کے ایک آدمی کو قتل کرنا چاہتے ہیں۔ تم اُسے جانتے ہو، وہ موٹا سا سویڈنی جس کا نام

اول اینڈرسن ہے ؟"

"ہاں"

"وہ یہاں ہر رات کھانا کھانے آتا ہے۔ آتا ہے نا؟"

"ہاں کسی کسی دن آتا ہے!"

"وہ پورے چھ بجے یہاں آیا کرتا ہے، ٹھیک ہے؟"

"ہاں اگر وہ آئے تو!"

"یہ ہم سب کچھ جانتے ہیں اُستاد"، میکس نے کہا "اب کوئی اور بات کرو۔ کبھی سینما دیکھنے بھی جاتے ہو؟"

"کبھی کبھی!"

"اکثر جایا کرو۔ تمہارے جیسے اُستاد کے لیے سینما بڑا مفید رہتا ہے!"

"تم اول اینڈرسن کو قتل کیوں کرتے ہو۔ اُس نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟

"ہمارا کچھ بگاڑنے کا اسے کبھی موقع ہی نہیں ملا ــ وہ تو ہماری صورت سے بھی واقف نہیں!"

"اور ہماری صورت وہ صرف ایک ہی دفعہ دیکھے گا" آل نے باورچی خانے میں سے کہا۔

"پھر تم اسے قتل کیوں کرتے ہو؟" جارج نے پوچھا۔

"ہم اسے ایک دوست کے کہنے پر قتل کر رہے ہیں، اپنے دوست کو ممنون کرنے کے لیے!"

"چپ رہو!" آل نے باورچی خانے سے پکار کر کہا "زیادہ باتیں نہ کرو!"

"میں تو اس استاد جی کا دل بہلا رہا ہوں۔ کیوں ٹھیک ہے ناں اُستاد؟"

"نہیں تم حد سے بڑھے جا رہے ہو"، آل نے کہا "دیکھو میرے والد اُستاد

اور نیکم خود بخود بہلے ہوئے ہیں میں نے اُن کی مشکیں تو کس لی ہیں جیسے کنواریاں کے گرجا میں کسی آشنا لڑکی کو باندھا جاتا ہے۔"

"میرا خیال ہے تم کسی کنواریوں کے گرجا میں بھی رہے ہو؟"

"کیا معلوم"

"تم کوشر گرجا میں رہے ہو، ٹھیک ہے"

جارج نے گھڑی کی طرف دیکھا۔

"اگر کوئی گاہک، میں تو اُن سے کہتا باورچی چھٹی پہ ہے۔ اگر وہ پھر بھی نہ نکلیں تو کہنا کہ میں خود جا کر کھانا پکاتا ہوں سمجھ لیا اُستاد؟"

"بہت اچھا" جارج نے کہا "لیکن یہ تو بتاؤ کہ اس کے بعد ہمارے ساتھ کیا سلوک کرو گے۔؟"

"یہ سب کچھ حالات پر منحصر ہے" میکس نے کہا "یہ ایسی بات ہے جس کا میں فی الحال کوئی جواب نہیں دے سکتا"

جارج نے پھر گھڑی کی طرف دیکھا۔ اب سوا چھ بج چکے ہیں۔ گلی کی طرف کا دروازہ کھلا اور ایک ٹریم کار کا ملازم داخل ہوا۔

"ہیلو جارج!" کھانے کے لیے کچھ ملے گا۔؟"

"سام چھٹی پر گیا ہے" جارج نے جواب دیا "آدھے گھنٹے تک واپس آئے گا"

"اچھا تو پھر کوئی اور دوکان دیکھتا ہوں" کہتے ہوئے وہ آدمی نکل گیا۔

جارج نے گھڑی دیکھی تو چھ بج کر بیس منٹ ہوتے تھے۔

"بہت خوب اُستاد" میکس نے کہا "تم بڑے شریف آدمی ہو"

"اسے معلوم تھا کہ اگر ذرا ایسی ویسی بات کی تو میں اس کے سر کے ٹکڑے

"ڈالوں گا" آل باورچی خانے سے بولا؛
"نہیں، یہ بات نہیں"، میکس نے کہا۔ "یہ اُستاد بڑا اچھا آدمی ہے۔ یہ بڑا اُستاد ہے۔ مجھے تو بڑا پسند ہے۔"
چھ بج کر پچپن منٹ پر جارج نے کہا "وہ اب نہیں آئے گا۔"
اس دوران میں دو گاہک اور بھی آئے۔ ایک دفعہ جارج نے باورچی خانے میں جا کر انڈوں کے سینڈوچ بھی بنائے، جو گاہک لفافے میں بند کر کے لے گیا۔
باورچی خانے میں آل اپنی ڈربی ہیٹ پیچھے کو کیے ہوئے کھڑکی کے پاس سٹول پر بیٹھا تھا۔ ایک بندوق اس کے ہاتھ میں تھی۔ نِک، اور باورچی ایک دوسرے کی طرف پشت کیے کونے میں بندھے پڑے تھے۔ اور ان کے موہنوں پر تولیہ بندھا تھا۔ جارج نے سینڈوچ تیار کیے۔ انہیں روغنی کاغذ میں لپیٹا اور پھر کاغذ کی تھیلی میں ڈال کر گاہک کے حوالے کر دیا۔ گاہک قیمت ادا کر کے چلا گیا۔
"شاباش۔ میرا اُستاد ہر کام ۔۔۔ میں بڑا ہوشیار ہے"، میکس نے کہا۔ "وہ کھانا بھی تیار کر لیتا ہے۔ اور ہر کام بڑی خوبی سے نپٹا لیتا ہے۔ تمہاری بیوی بڑی خوش رہے گی اُستاد!"
"ہاں ٹھیک"، جارج نے کہا "اور یہ بھی سُن لو کہ تمہارا دوست اول اینڈرسن نہیں آئے گا۔"
"ہم دس منٹ اور اس کا انتظار کریں گے"، میکس نے کہا۔
میکس آئینے اور گھڑی، دونوں کی طرف دیکھتا رہا۔ گھڑی میں سات بھی بج گئے اور سات بج کر پانچ منٹ ہو گئے۔

"آجاؤ آل" میکس نے کہا، "آؤ چلیں، اب وہ نہیں ... گے"
"پانچ منٹ اور دیکھ لو" آل نے باورچی خانے ... سے کہا۔
ان پانچ منٹ میں ایک گاہک اور آ گیا۔ جارج نے اس سے
کہا کہ باورچی بیمار ہے۔
"جہنم میں بھیجو اسے، اور کوئی دوسرا باورچی رکھ لو" گاہک نے کہا
"تم اپنا ہوٹل چلانا نہیں چاہتے؟" گاہک بڑبڑاتا ہوا ... گیا۔
"آجاؤ، آل"، میکس نے کہا۔
"ان دو استادوں اور نیگرو کا کیا کرنا ہے؟"
"ان کی فکر نہ کرو، سب ٹھیک ہے۔"
"اچھا؟"
"ہاں، ہمارا کام ختم ہو گیا۔"
"لیکن مجھے اطمینان نہیں ہے" آل نے کہا، "تم باتیں بہت کرتے
ہو۔"
"پروا نہ کرو" میکس نے کہا۔ "کسی نہ کسی طرح ہمیں دل بھی بہلانا
ہوتا ہے۔"
"لیکن اس کے باوجود میں یہی کہوں گا کہ تم باتیں ضرورت سے زیادہ
کر جاتے ہو" آل نے کہا۔ وہ باورچی خانے سے باہر آ گیا۔ بندوق کی
نالی گندے سے الگ کر لی اور اپنے اوورکوٹ کے نیچے رکھ لی۔ کوٹ
پہلے ہی تنگ تھا، اس لیے ابھار ذرا نمایاں رہا۔ اس نے دستانے پہنے
ہوئے ہاتھوں سے کوٹ کی سلوٹیں درست کیں۔
"اچھا خدا حافظ، استاد" اس نے جارج سے کہا۔ "تمہاری قسمت

بڑی تیز ہے۔"

"واقعی، تمہاری قسمت بڑی تیز ہے۔" میکس نے کہا۔ "تم گھوڑ دوڑ پر دل کھول کر شرطیں لگایا کرو۔"

دونوں دروازے سے باہر نکل گئے۔ جارج انہیں تیز روشنی میں سڑک عبور کرتے ہوئے کھڑکی میں سے دیکھتا رہا۔ وہ اپنے چست اوورکوٹوں اور ڈربی ہیٹوں میں کسی ناٹک کے گویئے نظر آتے تھے۔ جارج نے باورچی خانے میں جا کر نک اور باورچی کو کھولا۔

"میں دوبارہ اسے برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں۔" سام نے کہا۔ "بس اب میرا سلام ہے۔"

نک اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس سے پہلے اُسے تولیے سے منہ بند کرانے کا تجربہ نہیں تھا۔

"کہو، کیا ہوا ان دو زنخیوں کا۔" وہ غصّے سے بھرا ہوا بولا۔

"وہ اول اینڈرسن کو قتل کرنے آئے تھے۔" جارج نے بتایا۔ "ان کا ارادہ تھا کہ جب وہ کھانا کھانے کے لیے آئے تو گولی مار کر ہلاک کر دیں۔"

"اول اینڈرسن کو؟"

"ہاں۔"

باورچی اپنے منہ کے دونوں کونوں پر انگوٹھے سے ٹٹول کر دیکھ رہا تھا "وہ سب چلے گئے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں،" جارج نے کہا۔ "اب جا چکے ہیں۔"

"مجھے تو یہ بات پسند نہیں۔" باورچی نے کہا۔ "میں تو اس سلوک کو ہرگز

برداشت نہیں کر سکتا۔"

"سنو" جارج نے نک سے کہا "تم جا مراول اینڈرسن سے ملو۔"

"بہت اچھا۔"

"میرا خیال ہے، تم ان باتوں میں دخل نہ دو۔" سام باورچی نے کہا۔

"تم ان سے دور دور ہی رہو۔"

"اگر تم جانا نہیں چاہتے تو نہ جاؤ۔" جارج نے کہا۔

"ان معاملات میں دخل دینے سے تمہیں کوئی فائدہ نہ ہوگا۔" باورچی نے پھر کہا۔ "تم اس سے پرے ہی رہو۔"

"میں اس سے جا کر ملتا ہوں۔" جارج نے کہا۔ "کہاں رہتا ہے؟"

باورچی نے اُن کی طرف سے منہ موڑ لیا۔

"نادان بچے سب کچھ کرنا چاہتے ہیں تو کر کے ہی چھوڑتے ہیں۔" اُس نے کہا۔

"وہ ہرش کے کمروں میں رہتا ہے۔" جارج نے نک کو بتایا۔

"تو میں جاتا ہوں۔"

بے برگ و بار درخت کی ٹہنیوں میں سے سڑک کا لیمپ نظر آ رہا تھا۔ نک ٹرین کی لائن کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا اگلے لیمپ کے پاس پہنچ کر ایک چھوٹی گلی میں داخل ہو گیا۔ تین مکان چھوڑ کر چوتھے میں ہرش کے کمرے تھے۔ نک نے دو زینے چڑھ کر گھنٹی بجائی تو ایک عورت نمودار ہوئی۔

"اول اینڈرسن یہیں ہے؟"

"کیا تم اسے ملنا چاہتے ہو؟"

"ہاں، اگر وہ یہیں ہو۔"

نک نے عورت کے پیچھے پیچھے سیڑھیاں طے کر لیں اور پھر دریا کی راستے کی پشت کی طرف ایک دروازے پر دستک دی۔

"کون ہے؟"

"مسٹر اینڈرسن، ایک صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں"، عورت نے کہا۔

"میں ہوں نک ایڈمز"

"آ جاؤ"

نک دروازہ کھول کر داخل ہو گیا۔ اول اینڈرسن پورا لباس پہنے ہوئے بستر میں لیٹا ہوا تھا۔ وہ بھاری جسم کا سکہ باز تھا اور اپنی چارپائی سے بھی لمبا تھا۔ وہ دو تکیوں پہ سر رکھے لیٹا تھا۔ اس نے نک کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

"کیا بات ہے؟" اُس نے پوچھا۔

"میں ہنری ہوٹل میں تھا وہاں دو آدمی آئے اور انہوں نے مجھے اور باورچی کو رسیوں سے باندھ دیا۔ وہ تمہیں قتل کرنے کے لیے آئے تھے۔"

اُس نے یہ الفاظ بڑی مضحکہ خیز طرز میں کہے۔ اول اینڈرسن خاموش رہا۔

"انہوں نے ہمیں باورچی خانے میں بند کر دیا" نک نے پھر کہنا شروع کیا۔ "وہ چاہتے تھے کہ جب کھانا کھانے کے لیے آؤ تو تمہیں گولی مار دیں"

اول اینڈرسن کا منہ دیوار کی طرف تھا۔ اُس نے یہ سُن کر بھی کوئی جواب نہ دیا۔

"جارج نے مجھ سے کہا کہ تمہیں آکر خبردار کر دوں"

"میں اس معاملے میں [illegible] سکتا ہوں" [illegible] کہا۔

"میں تمہیں اُن کا حلیہ بتا دوں؟"

"[illegible] کرکے کیا کروں گا۔ بہرحال آپ نے جو زحمت اُٹھائی ہے۔ اس کے لیے شکرگزار ہوں" [illegible] سے دیوار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"شکریے کی کیا ضرورت ہے"

نِک اس عظیم الجثہ آدمی کو بستر پہ لیٹے ہوئے دیکھنے لگا۔

"اگر تم کہو تو میں پولیس کو اطلاع کر دوں؟"

"نہیں" اول نے کہا۔ "اس سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔"

"کوئی اور خدمت ہو تو بتائیے"

"نہیں، کوئی نہیں"

"ممکن ہے اُن لوگوں نے صرف دھمکانے کے لیے ایسا کیا ہو"

"نہیں یہ خالی دھمکی بھی معلوم نہیں ہوتی"

اول اینڈرسن نے دیوار کی طرف کروٹ بدل لی۔

"صرف اتنی بات ہے کہ باہر جانے کے لیے میرا دل نہ چاہتا تھا۔ میں صبح سے یہیں پڑا ہوں"

"تم شہر سے باہر کیوں نہیں چلے جاتے؟"

"نہیں" اول اینڈرسن نے کہا۔ "یہ بھاگتے پھرنا مجھے پسند نہیں ہے۔"

وہ دیوار کی طرف دیکھتا رہا۔

"اب اس وقت تو کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا۔"

"تم اس کا کوئی انتظام نہیں کر سکتے؟"

"نہیں" وہ اسی جذبات سے عاری لہجے میں بولا "اس وقت کوئی ایسی بات نہیں جس پر عمل کیا جا سکے۔ تھوڑی دیر کے بعد میں باہر جانے کے متعلق سوچوں گا۔"

"تو میں واپس جا کر جارج سے بات کر دوں؟"

"اچھا خدا حافظ" اول اینڈرسن نے کہا۔ اس نے اب بھی نِک کی صورت نہ دیکھی۔ "تمہارے آنے کا بہت بہت شکریہ۔"

نِک کمرے سے باہر آ گیا۔ جب وہ دروازہ بند کرنے لگا تو اُس نے ایک دفعہ پھر اول اینڈرسن کی طرف دیکھا، جو پورا لباس پہنے دیوار کی طرف منہ کئے لیٹا ہوا تھا۔

"وہ صبح سے اسی طرح اپنے کمرے میں لیٹا ہوا ہے" عورت نے سیڑھیوں سے نیچے آ کر بتایا۔ "میرا خیال ہے اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، میں نے اُس سے کہا تھا۔ مسٹر اینڈرسن خزاں کا خوشگوار دن ہے۔ تم باہر جا کر تھوڑی دیر سیر کیوں نہیں کرتے؟ لیکن اس کی طبیعت ہی مائل نہ تھی۔"

"شاید وہ باہر نکلنا نہیں چاہتا۔"

"میرا خیال ہے اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے" عورت نے کہا۔

"یہ بہت اچھا آدمی ہے، یہ مکّے باز ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔"

"ویسے تو معلوم ہی نہیں ہوتا۔ ہاں اس کے منہ کی طرف دیکھو، تو معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ مکّہ باز ہے۔" عورت نے کہا۔ وہ مکان کے دروازے پر کھڑے باتیں کر رہے تھے "وہ بڑا ہی نرم مزاج ہے۔"

"اچھا خدا حافظ، مسز ہرش" نِک نے کہا۔

"میں مسز برنش نہیں ہوں،" عورت نے بتایا۔ "وہ تو اس مکان کی مالک ہے۔ میں صرف اس کی نگرانی کرتی ہوں۔ میرا نام مسز بیل ہے۔"

"اچھا خدا حافظ مسز بیل۔"

"خدا حافظ،" عورت نے کہا۔

نک تاریک گلی میں سے نکل کر لیمپ کی روشنی میں پہنچا۔ اور پھر ٹریم کی لائن کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا ہنری ہوٹل میں آیا۔ جارج کاؤنٹر کے پیچھے کھڑا تھا۔

"تم اوّل سے ملے ہو؟"

"ہاں وہ اپنے کمرے ہی میں ہے۔ لیکن باہر نکلنا نہیں چاہتا۔"

جب باورچی نے نک کی آواز سنی تو باورچی خانے سے باہر نکل آیا۔

"میں تم لوگوں کی آواز بھی سننا نہیں چاہتا۔" اس نے کہا اور دروازہ بند کر لیا۔

"تم نے یہاں والا سارا معاملہ اس سے کہہ دیا ہے۔"

"ہاں۔ میں نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ غالباً اسے سب کچھ معلوم ہے۔"

"اب وہ کیا کرنا چاہتا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں۔"

"تو وہ اسے قتل کر دیں گے؟"

"ہاں قتل تو کر دیں گے۔"

"میرا خیال ہے شکاگو میں اس نے کوئی جھگڑا مول لیا ہو گا۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے،" نک نے جواب دیا۔

"بڑی ہی خطرناک بات ہے۔"

"بڑی سخت خطرناک" تک نے کہا۔

کچھ دیر وہ خاموش رہے۔ جارج نے ایک تولیہ لے کر سارے کونٹر کو صاف کیا۔

"معلوم نہیں اس نے کیا کیا ہے؟"

"کسی کے ساتھ چالاکی کی ہو گی، ایسی ہی باتوں پر یہ لوگ قتل ہوا کرتے ہیں۔"

"میں تو شہر چھوڑ کر کہیں چلا جاتا ہوں" نک نے کہا۔

"ہاں، بڑی مناسب بات ہے" جارج نے کہا۔

"مجھ سے تو یہ برداشت نہیں ہوتا کہ وہ اپنے کمرے میں سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے یونہی پڑا ہے۔ بڑی ہولناک بات ہے۔"

"تم اس کے متعلق سوچو ہی نہیں، یہ زیادہ مناسب ہے" جارج نے کہا۔

سِپاہی کا گھر

جب فوسالٹا کے محاذ پر بمباری سے خندقوں کے ٹکڑے اُڑے جا رہے تھے تو وہ ایک خندق میں چت لیٹا ہوا تھا، اُس کا پسینہ بہہ رہا تھا، اور وہ دُعا مانگ رہا تھا کہ اے یسوع مسیح مجھے اس جہنم سے نجات عطا فرما۔ اے مسیح، اپنے رحم و کرم کے صدقے میں اگر تو اس وقت میری جان بچا لے تو میں تیرے سارے احکام مانوں گا۔ میں تجھ پر پکا ایمان رکھتا ہوں۔ اور میں دُنیا میں ہر اِیک سے یہی کہوں گا کہ تیرے سوا اور کوئی نجات دہندہ نہیں ہے۔ پیارے یسوع رحم کر رحم — بمباری کی آواز آہستہ آہستہ دُور ہوتی گئی۔ ہم خندقوں کو درست کرتے گئے اور صبح سُورج طلُوع ہوا تو دن بڑا مرطوب اور گرم، مسرت افزا اور پُر سکون تھا۔ اگلی رات جب وہ میسٹر میں گلابی بنگلے کے اندر ایک لڑکی کو بغل میں لیے اوپر کی منزل میں جا رہا تھا تو اُس نے

اس لڑکی سے۔ ایسُوع کی کوئی بات نہ کہی۔ اور نہ کبھی کسی اور سے اس کا ذکر کیا۔

کریبس جب فوج میں بھرتی ہوکر جنگ میں گیا تو وہ کنساس کے ایک میتھوڈسٹ کالج میں تعلیم پارہا تھا۔ اس کی ایک تصویر اپنے فرقے کے بھائی بندوں کے ساتھ اُتری ہوتی تھی جس میں سب کے کالر ایک ہی تراش کے اور یکساں اُونچائی کے تھے۔ وہ ۱۹۱۷ء میں بحری فوج میں بھرتی ہُوا اور امریکہ میں اس وقت واپس آیا جب ۱۹۱۹ء میں دوسری ڈویژن رائن سے واپس آئی۔

رائن میں اتری ہوئی ایک اور تصویر بھی ہے جس میں وہ دو جرمن لڑکیوں اور ایک کارپورل کے ساتھ کھڑا ہے۔ کریبس اور کارپورل دونوں اپنی اپنی وردیوں میں بمشکل سمائے ہوئے ہیں۔ جرمن لڑکیاں معمولی شکل وصورت کی ہیں۔ تصویر میں دریائے رائن نظر نہیں آرہا۔

جس زمانے میں کریبس اوکلاہامہ میں اپنے گھر واپس آیا تو بہادرانِ وطن کے استقبال کا جوش وخروش ختم ہو چکا تھا۔ وہ اصل میں بہت دیر سے پہنچا تھا۔ شہر کے جوانوں کا واپسی پر بڑے زور کا خیر مقدم ہُوا تھا۔ لوگوں نے بڑی مجنونانہ حرکتیں کی تھیں۔ اب اس کا ردِّ عمل ہو رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لوگ کریبس کے، جنگ ختم ہونے کے بعد اتنی دیر سے پہنچنے کو مضحکہ خیز خیال کرتے ہیں۔

شروع میں تو کریبس جنگ کا ذکر کرنا پسند نہ کرتا تھا۔ حالانکہ وہ بلیوو ڈ، سائیسان، شمپین، سینٹ میہیل اور ارگان میں رہ چکا تھا۔ اس کے بعد اسے

جنگ کی باتیں کرنے کی خواہش ہوئی لیکن کوئی سنتا نہ چاہتا تھا۔ لوگ ظلم کی اتنی مبالغہ آمیز باتیں سن چکے تھے کہ حقیقی حالات انہیں دلچسپ نہ معلوم ہوتے تھے۔ کریبس کو معلوم ہوا کہ لوگوں کو باتیں سننے پر آمادہ کرنے کے لئے جھوٹ بولنا ضروری ہے لیکن جب اُس نے دو ایک مرتبہ جھوٹے قصے سنائے تو خود اس پر ایسا ردِ عمل ہوا کہ جنگ کی باتوں سے نفرت ہو گئی۔ جھوٹ بولنے کی وجہ سے وہ تمام واقعات اسے ناگوار معلوم ہونے لگے جو خود اس پر بیت چکے تھے۔

وہ کام جو ایک خاص وقت میں اسے بڑی عقل و خرد کے معلوم ہوتے تھے۔ اُس وقت اسے یہی احساس ہوتا تھا کہ جو کچھ اُس نے کیا ہے وہی مردوں کے کرنے کی بات تھی، بڑی آسان اور فطری، حالانکہ وہ اس کے سوا کچھ اور بھی کر سکتا تھا۔ اب سوچنے سے اُن میں کوئی عقل و خرد کا اثر نظر نہ آتا تھا۔

اس کے جھوٹ بڑے ہی پھیکے ہوتے تھے۔ وہ اُن باتوں کو اپنے ساتھ منسوب کر لیا کرتا تھا جو دوسروں نے دیکھی تھیں، یا سُنی تھیں۔ اور بعض بے سروپا باتوں کو حقیقت کے طور پر بیان کرتا تھا جن سے سب فوجی پہلے ہی سے واقف تھے۔ فوجی کلب میں اس کے جھوٹ بھی کوئی جوش نہ پیدا کرتے تھے۔ اس کے دوست آشناؤں نے پہلے ہی سُنا ہوا تھا کہ ارگان کے جنگلوں میں جرمن عورتیں مشین گنوں کے ساتھ زنجیروں سے جکڑی ہوئی دیکھی گئی ہیں۔ بعض تو ایسی باتوں میں یقین ہی نہ رکھتے تھے اور بعض اپنی وطن پرستی کے جذبات میں اتنے سرشار تھے کہ وہ اُن جرمن توپچیوں میں دلچسپی ہی نہ لینا چاہتے تھے جو زنجیروں سے جکڑے ہوئے نہ ہوں۔ چنانچہ اس کی کہانیوں پر کوئی کان نہ دھرتا تھا۔

کریبس کو جھوٹ اور مبالغہ کا تجربہ کرنے کے بعد اب اس سے گھن

آنے لگی تھی - اور جب کبھی اسے کسی جوانمرد سپاہی سے ملنے کا اتفاق ہوتا اور کسی ناچ رنگ کی محفل میں اس سے چند لمحوں کی گفتگو کا موقعہ ملتا، تو اسے اس بات کا احساس ہو جاتا کہ وہ اپنی ساری فوجی زندگی میں بڑی بُری طرح ڈرتا اور خوف کھاتا رہا ہے - چنانچہ اس کے پاس کہنے کی کوئی بات ہی باقی نہ رہی

آج کل گرمیاں نکل رہی تھیں - اسے دن چڑھے تک بستر میں پڑے رہنے کی عادت ہو گئی تھی - پھر اُٹھ کر وہ شہر تک جاتا - لائبریری سے ایک آدھ کتاب لے آتا - دوپہر کا کھانا بھی گھر ہی پر کھاتا اور پھر بازار کے رُخ برآمدے میں بیٹھ کر کتاب پڑھتا رہتا - اس سے بھی اکتا کر وہ شہر سے گذرتا ہوا دن کے گرم اوقات فوجی کلب کی خنک فضا میں گذارتا اور وہاں تاش کھیلتا رہتا -

شام کے وقت وہ الغوزے پر مشق کرتا، پھر شہر تک جاتا، واپس آ کر کچھ دیر مطالعہ کرتا اور پھر سو جاتا - اپنی دو چھوٹی بہنوں کے لئے اب بھی وہ ایک سورما تھا - اگر وہ چاہتا تو ماں اس کا ناشتہ اُسے بستر ہی میں کھلا دیا کرتی - ابھی وہ بستر ہی میں پڑا ہوتا کہ ماں آ کر اُس سے جنگ کے واقعات سنانے کی فرمائش کرتی - لیکن اس کی توجہ بہت سے کاموں کی طرف ہوتی تھی - اس کا باپ کوئی خاص دلچسپی نہ لیتا تھا -

جنگ میں جانے سے پہلے کربیس کو باپ کی موٹر کار باہر لے جانے کی اجازت نہ تھی - اس کا باپ جائیداد کا کاروبار کرتا تھا - اور اکثر زمین کا کوئی ٹکڑا دکھانے کے لئے اُسے گاہک کو کار پر لے جانا پڑتا تھا - یہ کار ہمیشہ فرسٹ نیشنل بنک کی عمارت کے سامنے کھڑی رہتی - جہاں دوسری منزل میں اس کے باپ کا دفتر تھا - اب جنگ کے بعد بھی اس کے باپ کے پاس وہی پُرانی کار تھی -

شہر میں کوئی خاص تبدیلی نہ ہوئی تھی، سوائے اس کے کہ ننھی لڑکیاں اب جوان ہو چکی تھیں - لیکن یہ لڑکیاں مخصوص دوستیوں اور بدلتی ہوئی عداوتوں

کی ایسی پیچیدہ دنیا میں گھری ہوئی تھیں کہ کربلیس میں اس دنیا میں داخل ہونے کی نہ ہمت تھی اور نہ جرأت۔ وہ انہیں دُور ہی سے دیکھتا رہتا۔ ان میں کئی خوبصورت لڑکیاں بھی تھیں۔ اکثر لڑکیوں نے اپنے بال کٹوا رکھے تھے۔ جب وہ جنگ میں گیا تھا۔ تو اُس وقت صرف ننھی لڑکیوں کے بال ایسے کٹوائے جاتے تھے۔ یہ لڑکیاں سویٹر پہنتی تھیں یا کوٹیاں جن کے کالر ولندیزیوں کے سے تھے۔ یہی آج کل کا رواج تھا۔ وہ اپنے برآمدے میں بیٹھا سڑک کے دوسرے کنارے پر انہیں چلتا پھرتا دیکھتا رہتا۔ اسے اِن لڑکیوں کو درختوں کے سائے میں گھومتے ہوئے دیکھنا بڑا بھلا معلوم ہوتا تھا۔ اسے ان کے ولندیزی کالر بھی پسند تھے اور ان کی ریشمی جرابیں اور بغیر ایڑی کے جوتیاں بھی۔ اُسے اُن کے کٹے ہوئے بال اور ان کی چال بھی پسند تھی۔

جب وہ شہر میں ہوتا تو اسے اِن سے کوئی خاص رغبت نہ ہوتی۔ وہ انہیں گریک کی آئس کریم کی دکان پر بھی دیکھنا پسند نہ کرتا تھا۔ اُسے ان کی ذات سے کوئی اُنس نہ تھا۔ وہ بڑی پیچیدہ ہستیاں تھیں۔ اور کچھ اور بھی بات تھی۔ وہ لڑکی تو چاہتا تھا لیکن اس کے لئے کوشش نہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ لڑکی حاصل کرنا تو چاہتا تھا لیکن اسے حاصل کرنے کے لئے بہت زیادہ وقت خرچ کرنے کو تیار نہ تھا۔ وہ سازشوں میں اور سیاست میں اُلجھنا نہ چاہتا تھا۔ اور نہ الجھانے کی کوشش کرنا چاہتا تھا۔ وہ لڑکی کی قدر و قیمت اتنی نہ سمجھتا تھا کہ اس کے لئے جھوٹ بھی بولا جائے۔

وہ نتائج کی ذمہ داری بھی اپنے سر نہ لینا چاہتا تھا۔ اور اس کے بغیر ہی زندگی بسر کرنا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ لڑکی کی اسے کوئی ضرورت بھی نہ تھی۔ فوج میں اس نے یہی سبق سیکھا تھا۔ صرف اتنا ہی ظاہر کرنا کافی ہے کہ تمہیں

لڑکی عورت ہے۔ اتنا تو ہر آدمی کرتا ہے۔ اگرچہ یہ بھی حقیقت نہیں۔ حقیقت میں لڑکی کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور یہ کتنی مضحکہ خیز بات ہے۔ پہلے ایک آدمی فخریہ کہتا ہے کہ میرے لئے لڑکیوں کا وجود بے معنی ہے، مجھے کبھی ان کا خیال بھی نہیں آتا، اور وہ مجھے ہاتھ لگانے کی جرأت نہیں کر سکتیں۔ پھر ایک دوسرا اتراتا ہے کہ میں لڑکیوں کے بغیر گزارہ ہی نہیں کر سکتا۔ مجھے ہر وقت لڑکیوں کی حاجت رہتی ہے، میں ان کے بغیر سو ہی نہیں سکتا۔

یہ سب جھوٹ ہے۔ حقیقت میں دونوں جھوٹے ہیں۔ لڑکی کی اس وقت تک کوئی ضرورت نہیں پڑتی جب تک ان کے متعلق سوچا نہ جائے۔ یہ بات بھی اسے فوج ہی میں معلوم ہوئی تھی۔ جب ان کے متعلق سوچو تو جلدی یا دیر سے کوئی نہ کوئی مل ہی جاتی ہے۔ اور جب تمہیں لڑکی کی زیادہ خواہش ہو تو ہمیشہ مل جاتی ہے، اس کے متعلق سوچنے کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔ جلد یا بدیر مل ہی جاتی ہے۔ یہ بات بھی اسے فوج ہی میں معلوم ہوئی تھی۔

اب بھی اگر کوئی لڑکی آجائے اور بہت باتیں نہ کرے، تو میں اسے پسند ہی کروں گا۔ لیکن وطن میں اب حالات کچھ ایسے پیچیدہ سے ہو گئے ہیں، کہ ان میں سے گذرنا محال سا نظر آتا ہے، اور نہ یہ بات اتنی مشقت اٹھانے کے قابل ہے۔ فرانسیسی اور جرمن لڑکیوں کی کچھ اور بات تھی۔ اُن کے متعلق اتنی باتیں نہ ہُوا کرتی تھیں۔ ان کے ساتھ نہ تو اتنی باتیں کی جا سکتی تھیں اور نہ اس کی ضرورت ہوتی تھی۔ ہم بڑی آسانی سے دوست بن جاتے تھے۔

کبھی اسے فرانس کی باتیں یاد آجاتیں اور کبھی جرمنی کی۔ لیکن جرمنی بہ حیثیت مجموعی بہتر تھا۔ جرمنی چھوڑنے پر اس کا جی نہ چاہتا تھا۔ وہ وطن واپس آنا نہ چاہتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ آگیا اور اب اپنے برآمدے میں

میں بیٹھا رہتا تھا۔
سڑک کے دوسری طرف چلتی ہوئی لڑکیاں کتنی بھلی معلوم ہوتی ہیں عورتیں اور جرمنی کی لڑکیوں کے مقابلے میں ان کی شکل و صورت بھی اچھی ہے۔ لیکن جس دنیا میں یہ بستی ہیں وہ کوئی اور دنیا ہے۔ وہ چاہتا تو تھا کہ ان میں سے ایک اُسے بھی مل جائے لیکن یہ کیسے ممکن تھا۔ ان کے خدوخال بڑے دلکش تھے اور وہ انہیں پسند بھی کرتا تھا۔ طبیعت کو اُکسانے والے خدوخال، لیکن ان کے ساتھ باتیں کرنا بڑا کٹھن مرحلہ تھا۔ اُسے لڑکی کی کوئی اشد ضرورت بھی نہ تھی، اگرچہ ان کی طرف دیکھتے رہنا کافی دلچسپ معلوم ہوتا تھا۔ اب جبکہ حالات پھر کچھ اچھے ہو رہے تھے ان کے لئے مصیبت کون اُٹھائے۔

وہ برآمدے میں بیٹھا ہوا جنگ کے موضوع پر ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ یہ جنگ کی تاریخ تھی اور اس میں اُن تمام لڑائیوں کے حالات درج تھے جن میں وہ خود شامل رہا تھا۔ جتنی کتابیں اس نے آج تک پڑھی تھیں یہ ان سب سے زیادہ دلچسپ تھی۔ کاش اس میں کچھ اور نقشے بھی ہوتے۔ جب اس موضوع پر اور کتابیں شائع ہوں گی۔ جن میں مزید تفصیلات اور نقشے بھی ہوں گے تو وہ انہیں ضرور پڑھے گا۔ اب اسے جنگ کے حقیقی حالات معلوم ہو رہے تھے۔ وہ بڑا اچھا سپاہی تھا، بڑا قابل قدر سپاہی۔

اُسے گھر آئے مہینہ بھر ہو گیا تھا کہ ایک روز اس کی ماں صبح ہی صبح اس کی خوابگاہ میں آئی اور اس کی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ اُس نے اپنے ہاتھ سے پیش بند کی سلوٹیں نکالیں اور کہا۔

"ہیرلڈ، میں نے کل رات تمہارے باپ سے باتیں کی تھیں۔ اس نے اجازت دے دی ہے کہ تم شام کے وقت بے شک کار لے

جایا کرو۔"

"اچھا؟" کریبس نے کہا۔ جو ابھی تک پوری طرح بیدار بھی نہ ہوا تھا۔ "کار لے جایا کروں؟ اچھا؟"

"ہاں، تمہارے باپ کو اس بات کا احساس تھا کہ جب کبھی تمہارا جی چاہے تم شام کے وقت گاڑی لے جا سکو لیکن اُس سے بات چیت کل رات ہی کو ہوئی ہے۔"

"مجھے معلوم ہے یہ تم ہی نے اُس سے کہا ہوگا۔" کریبس نے کہا

"نہیں یہ تمہارے باپ نے ہی تجویز پیش کی تھی اور مجھے تمہارے ساتھ بات کرنے کے لئے کہا تھا۔"

"لیکن یہ تمہیں نے اُس سے کہا ہوگا۔" یہ کہتے ہوئے کریبس اُٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔

"آؤ ہیرلڈ اب نیچے چل کر ناشتہ کرلو۔" ماں نے کہا۔

"میں کپڑے پہن کر ابھی آیا۔"

اس کی ماں کمرے سے باہر نکل گئی۔ وہ حجامت بناتے منہ ہاتھ دھوتے اور کپڑے پہنتے ہوئے کسی چیز کے تلنے کی آواز سنتا رہا۔ وہ ناشتہ کر رہا تھا کہ اس کی بہن ڈاک لئے ہوئے آئی۔

"اوہ ہیر تم ہو؟ عجیب خوابیدہ سر جانور ہو، بھلا تم بستر سے اُٹھتے ہی کیوں ہو؟"

کریبس نے اس کی طرف دیکھا، اُسے اپنی اس بہن سے بڑی محبت تھی۔

"اخبار آیا ہے؟" اُس نے پوچھا۔

لڑکی نے "کنساس سٹی سٹار" کا پرچہ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ اُس نے

اوپر لپٹا ہوا بھورا کاغذ پھاڑ کر اخبار کا کھیلوں کا صفحہ نکالا۔ اور اسے دوسرا کر کے پانی کی صراحی کے ساتھ لگا کر دلیئے کی پلیٹ سے تھامے رکھا۔ تاکہ ناشتہ کرتے ہوئے پڑھتا بھی جائے۔

"ہیرلڈ!" اُس کی ماں نے باورچی خانے کے دروازے سے آواز دی۔ "بیٹے اخبار گندا نہ کرنا۔ اگر اخبار گندا ہو جائے تو تمہارا باپ بڑا ناراض ہوتا ہے۔"

"میں گندا نہیں کر رہا" کریبس نے جواب دیا۔

اس کی بہن میز کے پاس بیٹھ کر اسے اخبار پڑھتے ہوئے دیکھنے لگی۔

"آج تیسرے پہر ہم سکول میں کھیلیں گے۔ میں گیند پھینکوں گی۔"

"خوب" کریبس نے کہا۔ "کیسی کھیلتی ہو؟"

"میں کئی لڑکوں سے بھی اچھا گیند پھینکتی ہوں۔ میں سب کو بتاتی ہوں۔ کہ تم نے مجھے سکھایا ہوا ہے۔ دوسری لڑکیاں بڑا بھدا کھیلتی ہیں۔"

"اچھا؟"

"میں سب سے یہی کہتی ہوں کہ تم میرے عاشق ہو۔ تم میرے عاشق ہو ناں، ہیرلڈ؟"

"ہاں ہاں۔"

"کیا بھائی عاشق نہیں کہلا سکتا، صرف اس لئے کہ وہ بھائی ہے؟"

"معلوم نہیں۔"

"یقیناً تمہیں معلوم ہو گا۔ اگر میں جوان ہوتی اور تم بھی چاہتے تو کیا تم میرے عاشق نہ ہو سکتے تھے؟"

"کیوں نہیں، تم میری معشوقہ ہو۔"

"کیا سچ مچ میں تمہاری معشوقہ ہوں؟"
"یقیناً"
"کیا تم مجھ سے محبت کرتے ہو؟"
"ہاں، ہاں۔"
"کیا تم مجھ سے ہمیشہ محبت کرتے رہو گے؟"
"یقیناً"
"کیا تم آج سکول میں آکر میرا کھیل دیکھو گے؟"
"شاید"
"تم جھوٹے ہو ہیرلڈ، تم مجھ سے محبت نہیں کرتے۔ اگر تم محبت کرتے تو ضرور آکر میرا کھیل دیکھتے۔"
کریبس کی ماں باورچی خانے سے کھانے کے کمرے میں آگئی۔ وہ ایک طشتری میں دو تلے ہوئے انڈے، کچھ بُھنا ہُوا گوشت اور کیک اُٹھائے ہوئے تھی،
"ہیلن تم تھوڑی دیر کے لئے بھاگ جاؤ۔" اُس نے بیٹی سے کہا۔ "مجھے ہیرلڈ سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔"
اُس نے طشتری ہیرلڈ کے سامنے رکھ دی اور کیک کے ساتھ کھانے کے لئے میپل سے شیرے کا جگ اٹھا لائی۔ پھر وہ کریبس کے سامنے میز پر بیٹھ گئی۔
"تھوڑی دیر کے لئے اخبار رکھ دو۔ ہیرلڈ۔" اس نے بیٹے سے کہا۔
"کریبس نے اخبار تہہ کر کے رکھ دیا۔
"ہیرلڈ، تم نے کچھ اپنے کام کاج کے متعلق بھی فیصلہ کیا ہے؟" اس کی ماں نے اپنی عینک اُتارتے ہوئے کہا۔
"نہیں" کریبس نے جواب دیا۔

"تمہیں بھی اب کام کرنے کا احساس ضرور ہو گیا ہو گا؟" اس کی ماں نے کینہ پن سے نہیں بلکہ اس انداز سے کہا کہ اُسے اس بات کا فکر ہے۔

"میں نے تو ابھی کچھ نہیں سوچا"۔

"خدا ہر ایک کا کارساز ہے۔" ماں نے کہا۔ "اُس کی بادشاہت میں کسی کو بیکار نہ رہنا چاہیئے۔"

"میں اُس کی بادشاہت میں نہیں رہتا۔"

"ہم سب اُسی کی بادشاہت میں رہتے ہیں۔"

کریبس پر ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی اضطراب اور کشیدہ خاطری چھا گئی۔

"مجھے تمہاری طرف سے بڑا فکر تھا ہیرلڈ، اور جن تحریلیات کا تم شکار تھے، اس کا بھی مجھے احساس ہے۔ مجھے معلوم ہے انسان کتنا کمزور طبع واقع ہوا ہے۔ مجھے وہ سب واقعات یاد ہیں جو ہمیں تمہارے نانا نے خانہ جنگی کے متعلق سنائے تھے۔ اسی وجہ سے میں تمہارے لئے دعائیں کرتی رہی اور اب بھی ہیرلڈ میرا سارا دن دعائیں مانگنے میں گذر جاتا ہے۔

کریبس اپنی پلیٹ میں چکنائی کو ٹھنڈک سے سخت ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

"تمہارا باپ بھی تمہارے لئے بڑا فکرمند ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ تمہاری آرزوئیں مردہ ہو چکی ہیں اور یہ کہ تم اپنی زندگی کا مقصد بھول چکے ہو۔ چارلی سمنٹر کو تم جانتے ہی ہو، تمہارا ہی ہم عمر ہے لیکن اس وقت معقول عہدے پر فائز ہے اور اب شادی بھی کر رہا ہے۔ سب لڑکے باری باری سے اپنی زندگی میں داخل ہوتے جا رہے ہیں۔ ہر ایک نے اپنی منزل کا انتخاب کر لیا ہے چارلی سمنٹر کی طرف ہی دیکھ لو، وہ معاشرے کے لئے ایک مفید ہستی

ثابت ہو رہا ہے۔"

کریبس خاموش رہا۔

"اُس طرف کیا دیکھتے ہو ہیرلڈ۔" اس کی ماں نے کہا۔ "تم جانتے ہو کہ ہم سب تم سے محبت کرتے ہیں۔ اور میں تمہارے ہی فائدے کے لئے یہ باتیں کہہ رہی ہوں۔ تمہارا باپ تمہاری آزادی میں مخل نہیں ہونا چاہتا۔ اس نے تمہیں کار چلانے کی اجازت بھی دیدی ہے۔ اگر تم شریف لڑکیوں کو اپنے ساتھ سیر کے لئے لے جانا چاہو تو بے شک لے جاؤ ہمیں اس سے خوشی ہو گی۔ ہم چاہتے ہیں کہ تم زندگی سے لطف اُٹھاؤ لیکن ہیرلڈ تمہیں کوئی نہ کوئی کام فوراً اختیار کر لینا چاہیئے۔ تمہارے باپ کو اس بات کا خیال نہیں ہے کہ تم کونسا کام کرتے ہو۔ وہ کہتا ہے کہ سارے کام باعزت ہوتے ہیں۔ لیکن تمہیں کوئی نہ کوئی کام شروع کر دینا چاہیئے۔ اسی نے مجھے کہا تھا کہ تمہارے ساتھ بات کروں۔ اگر تم چاہو تو دفتر میں اس سے مل بھی لینا۔"

"تمہیں کچھ اور بھی کہتا ہے؟" کریبس نے کہا۔

"ہاں کہتا ہے میرے بیٹے تمہیں اپنی ماں سے محبت نہیں ہے؟"

"نہیں" کریبس نے جواب دیا۔

ماں نے بیٹے پر نظر ڈالی۔

اُس کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ پھر وہ رو پڑی۔

"مجھے کسی سے بھی محبت نہیں ہے" کریبس نے پھر کہا۔

اس سے تو مطلب حل نہ ہُوا۔ نہ اپنا مافی الضمیر نہ بتا سکا تھا۔ اور وہ اسے پا بھی نہ سکتی تھی۔ ایسی بات کہنا ہی بیوقوفی تھی۔ اس سے تو اُسے صدمہ ہُوا ہے۔ وہ اُٹھ کر ماں کی طرف گیا اور اس کا بازو پکڑ لیا۔ وہ

اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھامے رو رہی تھی۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا ماں" اس نے کہا۔ "مجھے کسی بات پر غصہ آیا ہوا تھا۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا کہ مجھے تم سے محبت نہیں ہے۔"

ماں روتی چلی گئی۔ کریبس نے اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ دیا۔

"ماں تم مجھ پر یقین نہیں کرتیں؟"

اس کی ماں نے اپنا سر ہلا دیا۔

ماں، ماں میری بات پر یقین کرو۔"

"بہت اچھا" ماں نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔ "میں تمہاری بات پر یقین کر لیتی ہوں، ہیرلڈ۔"

کریبس نے اس کے بالوں کو چوم لیا۔ اُس نے اپنا منہ اس کی طرف اٹھا دیا۔

"میں تمہاری ماں ہوں۔ جب تم ننھے سے بچے تھے تو میں تمہیں چھاتی سے لگائے لگائے پھرتی تھی۔"

کریبس پر رقت طاری ہو گئی۔

"مجھے معلوم ہے ماں، میں تمہارا فرمانبردار بیٹا بننے کی کوشش کروں گا۔"

"تو آؤ گھٹنوں کے بل جھک کر میرے ساتھ دعا کرو۔"

کریبس اور اس کی ماں، دونوں کھانے کی میز کے پاس گھٹنوں کے بل جھک گئے۔

"اب دعا مانگو ہیرلڈ۔"

"مجھے دعا کرنا نہیں آتا۔"

"کوشش تو کرو"

"مجھ سے کوشش بھی نہیں ہوتی۔"

"تو کیا میں تمہارے لئے دعا کروں؟"

"ہاں"

چنانچہ ماں نے بیٹے کے لئے دعا کی۔ اور جب وہ فارغ ہو کر اُٹھے تو کرہیس نے ماں کو چوم لیا، اور گھر سے باہر چلا گیا۔ وہ اپنی زندگی کو ہر قسم کی الجھنوں سے بچانا چاہتا تھا۔ اب تک تو کوئی الجھن پیدا نہ ہوئی تھی۔ اُسے اپنی ماں پر ترس ضرور آتا تھا لیکن اُس نے بھی اسے جھوٹ بولنے پر مجبور کر دیا۔ اُس نے کنساس جا کر کوئی کام تلاش کرنے کا تہیہ کر لیا تاکہ ماں کو تسلی ہو جائے۔ لیکن اس کے جانے سے پہلے ایک اور جھگڑا ضرور پیدا ہو گا۔ کیونکہ وہ باپ کے دفتر میں نہ جانا چاہتا تھا۔ وہ اپنی زندگی کو ہموار راستے پر چلانا چاہتا تھا۔ اور اب وہ اس پر گامزن ہو چکا تھا۔ خیر بہر حال یہ قضیہ تو ختم ہُوا۔ اب وہ سکول کے میدان میں جا کر ہیلین کا کھیل بھی دیکھے گا۔

اٹلی کا سفر

درے میں سے گذرنے والی سڑک سخت اور ہموار تھی اور صبح سویرے ابھی اس پر گرد اُڑنی شروع نہ ہوئی تھی۔ نیچے کی پہاڑیوں پر شاہ بلوط اور چیسٹ نٹ کے جنگل تھے اور دُور نشیب میں سمندر دکھائی دے رہا تھا سامنے برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑیاں نظر آرہی تھیں۔

ہم گھنے جنگلوں میں سے گذرتے ہوئے درے سے نیچے اُترے سڑک کے کنارے کوئلے کی بوریوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے اور درختوں میں سے کوئلہ جلانے والوں کے جھونپڑے نظر آرہے تھے۔ آج اتوار کا دن تھا۔ ہم پہاڑیوں کی گھاٹیاں چڑھتے اور اُترتے لیکن درے کی بلندی سے ڈھلتے ہوئے جنگلوں اور دیہات میں سے گذرتے چلے جا رہے تھے۔

گاؤں کی زمینوں میں کھیتیاں اور انگور کی بیلیں اُگی ہوئی تھیں۔ کھیت بھورے رنگ کے تھے اور انگور کی بیلیں ناہموار اور گھنی۔ گھروں کی دیواریں سفید تھیں اور سڑکوں پر لوگ اتوار کے لباس پہنے ہوئے کھیل تماشے میں مصروف تھے۔ بعض گھروں کی دیواروں کے ساتھ ناشپاتیوں کے درخت اُگے ہوئے تھے

اور ان کی شاخیں دیواروں سے چمٹی ہوئی تھیں۔ گاؤں کے اردگرد تھوڑی جگہ خالی کر کے انگور کی کاشت کی گئی تھی اور اس سے آگے جنگل شروع ہو جاتا تھا۔

سپینریا سے بیس کلومیٹر ادھر ایک گاؤں نظر آیا جس کے چوراہے میں لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ ایک نوجوان اپنا سوٹ کیس اٹھائے ہوئے ہماری طرف بڑھا اور کہنے لگا کہ مجھے سپینریا تک لے چلو۔

"ہماری کار میں صرف دو ہی نشستیں ہیں اور دونوں رُکی ہوئی ہیں۔" میں نے اسے بتایا۔ ہمارے پاس ایک پرانی فورڈ کوپے تھی۔

"میں پائیدان پر کھڑا ہو جاؤں گا۔"

"تمہیں تکلیف ہوگی"

"کوئی حرج نہیں۔ مجھے سپینریا ضرور پہنچنا ہے"

"ہم اسے ساتھ لے لیں؟" میں نے گائے سے پوچھا۔

"یہ تو ہر صورت میں جانے کو تیار ہے۔" گائے نے کہا۔ نوجوان نے ایک پارسل کھڑکی میں سے پکڑاتے ہوئے کہا "ذرا اس کا خیال رکھنا" دو آدمیوں نے اس کا سوٹ کیس کار کے پچھلے حصے میں ہمارے سامان کے اوپر رکھ کر باندھ دیا۔ اس نے سب آدمیوں سے ہاتھ ملایا اور کہا کہ ایک فاشسٹ کو جسے ایسے سفروں کی عادت ہو چکی ہو، کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ وہ کار کے بائیں پائیدان پر کھڑا ہو گیا اور دائیں بازو کھڑکی سے اندر ڈال کر سہارا لے لیا۔

"اب چلائیے" اس نے کہا۔ لوگوں نے ہاتھ ہلا ہلا کر اسے الوداع کہی اور وہ بھی اپنا بائیں ہاتھ کو ہلاتا رہا۔

"اس نے کیا کہا تھا؟" گائے نے پوچھا۔

"وہ کہتا تھا کہ کار چلائیے"

"اچھا آدمی معلوم ہوتا ہے،" گائے نے کہا۔

سڑک ایک دریا کے ساتھ ساتھ جا رہی تھی۔ دریا کے پار پہاڑیاں تھیں۔ تیز دھوپ سے گھاس پر جمی ہوئی اوس پگھلتی جا رہی تھی فضا صاف اور سرد تھی اور کار کے شیشے سے ٹھنڈی ہوا داخل ہو رہی تھی۔

"اس برفانی ہوا سے اس کا کیا حال ہو رہا ہوگا؟" گائے نے سڑک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ہمارے مہمان کی وجہ سے وہ بائیں طرف کی کھڑکی سے باہر نہ دیکھ سکتا تھا۔ نوجوان کار کی بائیں طرف سے یوں بڑھا ہوا تھا جیسے جہاز کے ماتھے پر نشان ہوتا ہے۔ اس نے اپنے کوٹ کا کالر اونچا اور ٹوپی نیچے کو کھینچی ہوئی تھی اور ٹھنڈی ہوا سے اس کی ناک یخ بستہ معلوم ہوتی تھی۔

"ممکن ہے یہ تنگ آجائے" گائے نے کہا "اس طرف ہمارا خراب ٹائر لگا ہوا ہے۔"

"اگر کہیں کار خراب ہو گئی تو یہ ہمیں خود ہی چھوڑ کر بھاگ جائے گا" میں نے کہا "اپنا سفری لباس خراب نہ کرے گا۔"

"خیر مجھے تو اس کی کوئی تکلیف نہیں" گائے نے کہا "لیکن ہر موڑ پر جس طرح یہ باہر کو لٹک جاتا ہے یہ مجھے پسند نہیں۔"

جنگل ختم ہو چکے تھے۔ سڑک اب دریا کو چھوڑ کر بلندی پر چڑھ رہی تھی۔ ریڈی ایٹر میں پانی کھول رہا تھا۔ بھاپ اور زنگار سے بھرے ہوئے پانی کے چھینٹے اڑ اڑ کر نوجوان کی طبیعت بیزار کر رہے تھے۔ انجن چیخ رہا تھا۔ گائے کے دونوں پاؤں پہلی سپیڈ کے پیڈل کو دبائے ہوئے تھے۔ کار اوپر ہی اوپر چڑھتی جاتی تھی۔ کبھی پیچھے، دائیں اور بائیں اور پھر اوپر،

پھر آخر ہموار راستہ آگیا۔ انجن کے چیخنے کی آواز بند ہو گئی۔ اور اِس سکوت میں ہائیڈرالک میں پانی اُبلنے اور بلونے کی آواز آنے لگی۔ سمندر اور سپینیریا سے اوپر ہم آخری پہاڑی سلسلے کو عبور کر رہے تھے۔ اب سڑک نیچے اترنا شروع ہوئی جس کے موڑ بڑے تیکھے تھے۔ ہر موڑ پر ہمارا مہمان باہر کو لٹک جاتا اور ہماری کار کے اُلٹنے میں بس ذرا سی کسر رہ جاتی۔

"تم اسے منع نہیں کر سکتے؟" گلنے نے کہا۔ "یہ اپنے بچاؤ کے احساس سے ایسا کر رہا ہے۔"

"یہ احساس اٹلی والوں کا نمایاں احساس ہے۔"

"اٹلی والوں نمایاں ترین احساس۔"

اب ہم ایپر سڑک کے موڑوں میں آ گئے، جن پر گھنوں گرد تھی۔ گرد اُڑ اُڑ کر زیتون کے درختوں کو ڈھانپ رہی تھی۔ سپینیریا سمندر کے ساتھ ساتھ پھیلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ شہر کے باہر سڑک ہموار ہو گئی تھی۔ ہمارے مہمان نے کھڑکی میں سے ہاتھ اندر ڈالا اور کہا۔

"میں یہیں اترنا چاہتا ہوں۔"

"گاڑی روک لو۔" میں نے گلنے سے کہا۔

گاڑی آہستہ ہو کر سڑک کے کنارے رک گئی۔ نوجوان اُتر گیا اور پھر سامان میں سے اپنا سوٹ کیس کھولنے کے لئے کار کی پشت کی طرف گیا۔

"میں اس لئے یہاں اتر رہا ہوں کہ مسافر لادنے کی وجہ سے آپ کو شہر میں کسی تکلیف کا سامنا کرنا پڑے۔ میرا پارسل دے دیجئے۔"

میں نے اسے پارسل دے دیا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کہا۔

"مجھے کتنا کرایہ ادا کرنا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں"

"کیوں؟"

"میں اس کا کیا جواب دوں؟" میں نے کہا

"تو پھر شکریہ" نوجوان نے کہا۔ اس سے پہلے اٹلی میں اگر کسی کی معمولی سے معمولی خدمت بھی کی جاتی، یہاں تک کہ کسی کو راستہ بتایا جاتا تو وہ "آپ کا شکریہ" "آپ کا بہت بہت شکریہ" یا "آپ کا ہزار بار شکریہ" کہا کرتا تھا۔ لیکن اس نے سب سے مختصر طریقہ اختیار کیا اور صرف "شکریہ" کہہ کر مشتبہ نظروں سے ہماری طرف دیکھنے لگا۔ گائے نے گاڑی چلا دی اور میں نے ہاتھ ہلاتے ہوئے اسے الوداع کہی۔ اس نے جواباً ہاتھ ہلانا شاید اپنی بڑائی اور عظمت کے خلاف سمجھا۔ ہم سپیزیا کی حدود میں داخل ہو گئے۔

"اس نوجوان کو اٹلی میں ابھی بہت سا سفر کرنا ہے۔" میں نے گائے سے کہا۔

"خیر! بیس کلومیٹر تو اس نے ہمارے ساتھ طے کر لئے۔" گائے نے کہا۔

سپیزیا میں کھانا

ہم سپیزیا میں کوئی کھانے کی جگہ تلاش کر رہے تھے۔ بازار فراخ تھے اور ان کے دونوں طرف زرد رنگ کے اونچے مکان کھڑے تھے۔ ہم ٹریم لائن پر چلتے ہوئے شہر کے وسطی حصے میں پہنچ گئے۔ مکانوں کی دیواروں پر مسولینی کی تصویریں جگہ جگہ بنی ہوئی تھیں جنہیں دیکھ دیکھ کر آنکھیں اُکتا گئی تھیں۔ تصویروں کے نیچے روغن سے "زندہ باد" لکھا ہوا تھا۔ اور روغن بہہ بہہ کر دیوار کی بنیادوں تک پہنچتا تھا۔ ذیلی گلیاں سمندر

ئے کنارے کی طرف جاتی تھیں جہاں لوگ اتوار کی چھٹی کی وجہ سے جمع ہوئے تھے۔ پتھریلے راستوں پر چھڑکاؤ ہو رہا تھا اور کہیں کہیں ریتلے قطعے کیچڑ میں میں تبدیل ہو گئے تھے۔ ہم ٹرام گاڑی سے بچتے ہوئے پیدل راستے کے ساتھ ساتھ جا رہے تھے۔

"کہیں سادہ سا کھانا کھائیں" گلاسٹر نے کہا۔

دو ریستورانوں کے سامنے ہم نے گاڑی روکی۔ میں اخبارات خریدنے لگا۔ دونوں ریستوران ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ تھے۔ ایک کے دروازے میں ایک لڑکی کھڑی تھی جو ہمیں دیکھ کر مسکرائی۔ ہم اسی میں داخل ہو گئے۔

اندر اندھیرا تھا۔ کمرے کے پچھلی طرف تین لڑکیاں ایک بوڑھی عورت کے ساتھ میز پر بیٹھی تھیں۔ ہمارے سامنے رُخ ایک اور میز پہ ایک ملاح بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے کھانے پینے کی کوئی چیز نہ تھی۔ اس سے پرے ایک اور نوجوان نیلا لباس پہنے کچھ لکھ رہا تھا۔ اس کے بال چمک رہے تھے، لباس سے بڑا بانکا اور چھیلا نظر آتا تھا۔

کمرے میں روشنی یا تو دروازے سے آتی تھی یا اس شیشے کی الماری میں سے جہاں سبزیاں، پھل اور گوشت کی رانیں اور چانپیں لٹکی ہوئی تھیں۔ ایک لڑکی نے ہماری فرمائش سنی اور دوسری جا کر دروازے میں کھڑی ہو گئی۔ ہم نے دیکھا کہ اس لڑکی نے اپنے گھریلو لباس کے نیچے اور کچھ بھی نہیں پہن رکھا جب ہم کھانوں کی فہرست دیکھ رہے تھے۔ اس لڑکی نے اپنی باہیں گلاسٹر کے گلے میں ڈال دیں۔ یہ تینوں لڑکیاں باری باری سے دروازے میں کھڑی ہوتی تھیں۔ بوڑھی عورت نے ان سے کچھ کہا۔ وہ تینوں آ کر اس کے پاس

بیٹھ گئیں۔

کمرے میں سوائے اُس دروازے کے جو باورچی خانے میں کھلتا تھا اور کوئی دروازہ نہ تھا۔ اس پر ایک پردہ پڑا ہوا تھا۔ لڑکی جو ہماری فرمائش لے گئی تھی سویاں لے کر آئی۔ پھر سُرخ شراب کی ایک بوتل لائی اور ہمارے ساتھ میز پر بیٹھ گئی۔

"دیکھو گائے تم کسی سادہ جگہ کی تلاش میں تھے"

"یہ سادہ تو نہیں۔ یہ تو بڑی پیچیدہ جگہ نکلی" گائے نے جواب دیا۔

"تم آپس میں کیا باتیں کر رہے ہو؟" لڑکی نے پوچھا۔ "تم جرمن ہو؟"

"ہاں، ہم جنوبی جرمنی کے باشندے ہیں۔ جنوبی جرمنی کے لوگ بڑے شیریں مزاج اور خوش طبع ہوتے ہیں۔"

"میں نہیں سمجھی۔"

"یہاں کے رسم و رواج کیا ہیں؟" گائے نے پوچھا۔ "اس لڑکی کو گلے میں باہیں ڈالنے سے میں روک نہیں سکتا؟"

"روکنے سے کیا حاصل۔ بات یہ ہے کہ مسولینی نے تمام قحبہ خانے بند کر دئے ہیں۔ اب یہ قحبہ خانہ تو نہیں، ریستوران ہے۔"

لڑکی نے صرف ایک ٹکڑے کا لباس پہنا ہوا تھا۔ اس نے میز پر آگے کو جھک کر دونوں ہاتھ اپنی چھاتیوں پر رکھ لئے اور مسکرانے لگی۔ اس کی مسکراہٹ ایک رُخ سے بھلی معلوم ہوتی تھی۔ اور وہی رُخ اس نے ہماری طرف پھیر رکھا تھا۔ اس کے خوبصورت رُخ میں کسی حادثے سے اور بھی اضافہ ہو گیا ہوگا کیونکہ اس کی ناک کا دوسرا رخ ایسے چپٹا ہو گیا ہوا تھا جیسے موم گرمی پہنچانے سے پگھل کر ہموار ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ بات نہیں

کہ اس کی ناک واقعی گرم موم کی طرح نظر آتی ہو، وہ تو بڑی ٹھنڈی اور مضبوط تھی
مفہوم: "تم مجھے پسند کرتے ہو نا؟" اس نے گلئے سے پوچھا۔

"وہ تو تم پر مرتا ہے" میں نے کہا "لیکن بے چارہ اطالوی زبان نہیں جانتا"

"یہ جرمن زبان ہی میں بات کرے" اس نے گلئے کے بالوں کو سہلاتے ہوئے کہا۔

"گلئے، اس خاتون سے اپنی زبان میں بات چیت کرو۔"

"تم کہاں سے آرہے ہو؟" خاتون نے پوچھا۔

"پوٹسڈم سے"

"اور تم کچھ دیر یہاں ٹھہروگے؟"

"اس پیلیسے سیبیزیا میں؟" میں نے پوچھا

"اس سے کہو ہمیں فوراً جانا ہے" گلئے نے کہا "اس سے کہو ہم سخت بیمار ہیں اور ہمارے پاس پیسہ بھی کوئی نہیں"

"میرا دوست ذن بیزار ہے" میں نے کہا "پرانے جرمنی کا ذن بیزار"

"اس سے کہو میں اس سے محبت کرتی ہوں"

میں نے اسے کہہ دیا۔

"تم خاموش کیوں نہیں ہو جاتے۔ یہاں سے مخلصی حاصل کرنے کی کوئی صورت کرو" گلئے نے کہا۔ عورت نے اپنا دوسرا بازو بھی اس کے گلے میں حمائل کر دیا۔

"اس سے کہو تم میرے معشوق ہو" خاتون نے کہا اور میں نے گلئے سے کہہ دیا۔

"خدا کے لئے یہاں سے نکلنے کی کوئی سبیل سوچو۔"

"تم لوگ آپس میں لڑ رہے ہو۔" خاتون نے کہا "تم ایک دوسرے سے محبت نہیں کرتے؟"

"ہم جرمن ہیں۔" میں نے فخریہ انداز میں کہا "جنوبی جرمنی کے پرانے باشندے۔"

"اس سے کہو، تم بڑے خوبصورت لڑکے ہو۔" خاتون نے کہا۔ گائے کی عمر اڑتیس سال کی ہے اور اسے اس بات میں بڑا فخر محسوس ہوتا ہے کہ لوگ اسے فرانس میں کسی تجارتی کمپنی کا نمائندہ سمجھتے ہیں۔ "تم بڑے خوبصورت لڑکے ہو۔" میں نے اس سے کہا۔

"کون کہتا ہے؟" گائے نے پوچھا "تم یا یہ عورت؟"

"یہی کہتی ہے۔ میں تو صرف تمہارا ترجمان ہوں۔ اور تم نے اسی مقصد کے لئے مجھے ساتھی بنایا تھا۔"

"شکر ہے کہ یہ بات اس نے کہی ہے۔ ورنہ میں تمہیں بھی یہیں چھوڑ جاتا۔"

"خیر اس بات کو چھوڑو۔ سپیزیا ہے بڑی پیاری جگہ۔"

"سپیزیا" خاتون نے کہا "تم لوگ سپیزیا کی باتیں کر رہے ہو؟"

"بڑی پیاری جگہ ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ میرا وطن ہے۔" اس نے کہا "سپیزیا میرا گھر ہے، اور اٹلی میرا وطن ہے۔"

"کہتی ہے کہ اٹلی میرا وطن ہے۔"

"اس سے کہو واقعی یہ تمہارا ہی وطن معلوم ہوتا ہے۔" گائے نے کہا۔

"نقل کے لئے تمہارے پاس کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بھئی، ہمارے پاس کیلے ہیں؟"

"کیلا اچھی چیز ہے۔ اس پر چھلکا تو ہوتا ہے۔" گگائے نے کہا۔

"آہا! اسے کیلے پسند ہیں۔" اس نے گگائے کو گلے سے لگا لیا۔

"کیا کہتی ہے؟" گگائے نے اپنا منہ موڑتے ہوئے پوچھا۔

"یہ اس لئے خوش ہو رہی ہے کہ تمہیں کیلے پسند ہیں۔"

"اس سے کہو۔ میں کیلے نہیں کھاتا۔"

"یہ کیلے نہیں کھاتے۔"

"آہ!" خاتون نے مرجھاتے ہوئے کہا۔ "انہیں کیلے پسند نہیں ہیں۔"

"اسے بتاؤ کہ میں ہر روز علی الصباح ٹھنڈے پانی سے غسل کرتا ہوں۔" گگائے نے کہا۔

"صاحب ہر روز ٹھنڈے پانی سے نہاتے ہیں۔"

"میں نہیں سمجھی۔"

کمرے کے دوسری طرف ملاح ابھی تک وہیں بیٹھا تھا۔ کسی نے بھی اس کی طرف توجہ نہ دی۔

"ہمارا بل لے آؤ۔" میں نے کہا

"نہیں، نہیں تم لوگ ابھی ٹھہرو۔"

"سنو" بانکے نوجوان نے جو لکھ رہا تھا اپنی میز سے پکارا۔ "انہیں جانے دو۔ ان سے کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔"

خاتون نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ "تم ٹھہرو۔ گگائے نہیں، تم اس سے ٹھہرنے کے لئے کیوں نہیں کہتے؟"

"ہمارا جانا ضروری ہے" میں نے کہا۔ "ہمیں پیسا پہنچنا ہے اور اگر

ہو سکا تو ہم رات تک فائرنز پہنچ جائیں گے۔ ہم دن گذرنے پر وہاں اپنی تفریح کا سامان پیدا کرلیں گے۔ اس وقت دن ہے اور دن کی روشنی میں ہمیں بہت سا فاصلہ طے کرنا ہے۔"

"تھوڑی دیر اور ٹھہرنا بڑا لطف دے گا۔"

"دن کی روشنی میں فاصلہ طے کرنا بے حد ضروری ہے۔"

"سنو" بانکے نوجوان نے پھر کہا "ان دونوں سے بحث کرنا فضول ہے۔ ان سے کچھ بھی حاصل نہ ہو گا۔ مجھے اس بات کا پورا علم ہے۔"

"ہمارا بل لے آؤ۔" میں نے کہا۔ وہ بوڑھی عورت سے ہمارا بل لے آئی اور پھر جا کر اُس کے پاس بیٹھ گئی۔ ایک اور لڑکی باورچی خانے سے نکلی اور کمرہ طے کرکے دروازے پر جا کھڑی ہوئی۔

"ان دو کو چھوڑ دو۔" بانکے آدمی نے اکتائی ہوئی آواز میں کہا "آؤ کچھ کھا لو۔ ان سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔"

ہم اپنا بل ادا کرکے کھڑے ہو گئے۔ ساری لڑکیاں، بوڑھی عورت اور بانکا جوان اکٹھے میز پر بیٹھ گئے۔ ملاح اپنے سر کو ہاتھوں میں تھامے بیٹھا تھا۔ جب تک ہم کھانا کھاتے رہے کسی نے اس سے بات نہ کی۔ لڑکی بوڑھی عورت سے ہماری ریزگاری لے آئی اور میز پر رکھ کر چلی گئی۔ ہم نے میز پر ایک سکہ چھوڑ دیا اور باہر نکل آئے۔ جب ہم کار میں بیٹھ کر چلنے لگے تو لڑکی نکل کر پھر دروازے میں کھڑی ہو گئی۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر الوداعی ہاتھ ہلایا۔ لیکن وہ خاموش اور بے حس و حرکت کھڑی رہی اور ہماری طرف دیکھتی رہی۔

بارش کے بعد

جب ہم جے تووا کے مضافات سے گذرے تو زور کی بارش ہو رہی تھی، ٹریم گاڑیوں اور موٹر ٹرکوں کے پیچھے آہستہ آہستہ چلنے کے باوجود کیچڑ اتنی اچھلتی تھی کہ پیدل راستے پر چلتے ہوئے لوگ ہمیں آتا دیکھ کر اندر گرد کے مکانوں کے دروازوں میں گھس جاتے تھے۔ سان یارڈی ایرینا۔ جے تووا کے مضافات میں صنعتی علاقہ ہے جہاں موٹروں کے گذرنے کے لئے دو کشادہ راستے بنے ہوئے ہیں۔ ہم اس خیال سے سڑک کے درمیان سے گذر رہے تھے کہ گھروں کو جاتے ہوئے لوگوں پر ہماری موٹر سے کیچڑ نہ پڑے۔ ہمارے بائیں طرف بحیرۂ روم تھا جس میں سے تیز ہوا کی وجہ سے بڑی بڑی لہریں اُٹھ اُٹھ کر ساحل سے ٹکرائیں اور ہماری کار پر چھینٹے اُڑاتیں۔ ایک دریا جو ہمارے اٹلی میں داخل ہونے کے وقت خشک اور پتھروں سے بھرا ہوا تھا، اب مٹیالے رنگ کے پانی سے کناروں تک بھرا ہوا بہہ رہا تھا۔ دریا کے گدلے پانی سے سمندر کا رنگ بھی بدل رہا تھا لیکن لہریں ساحل پر ٹکرا کر پتلی پڑ جاتیں اور پانی صاف معلوم ہوتا۔ ہوا سے اس کے ٹکڑے اُڑ اُڑ کر سڑک کے دوسرے کنارے تک جا پہنچتے۔

ایک بڑی کار تیز چلتی ہوئی ہمارے پاس سے گذر گئی اور گدلے پانی کی ایک چادر ہمارے شیشے اور ریڈیئٹر پر پڑ گئی۔ شیشے کو صاف کرنے والی کمانیاں آگے اور پیچھے چلنے لگیں اور کیچڑ کی تہہ کو پھیلانے لگیں سیسٹری میں رُک کر ہم نے کھانا کھایا۔ اس ریستوران میں آگ موجود نہ تھی اس لئے ہم اپنی ٹوپیاں اور کوٹ پہنے رہے۔ کھڑکی میں سے ہمیں اپنی کار نظر

آرہی تھی۔ ساری کی ساری کیچڑ میں لت پت ہو رہی تھی اور اس کے پاس ہی چند کشتیاں کھڑی تھیں جنہیں دھکیل کر لہروں کی زد سے باہر کنڑا کیا گیا تھا۔ ریستوران میں اتنی سردی تھی کہ ہمیں اپنے سانس بھی دکھائی دے رہے تھے۔

پسٹا اشیوٹا مزیدار تھا اور شراب میں چپکڑی کا مزا تھا اس لئے ہم اس میں پانی ملا کر پیتے رہے۔ اس کے بعد بیرا گائے کے پسندے اور تلے ہوئے آلو لایا۔ ایک مرد اور ایک عورت کمرے کے دوسرے سرے پر بیٹھے تھے۔ وہ اُدھیڑ عمر کا تھا اور عورت جوان تھی اور کالا لباس پہنے ہوئے تھی۔ جتنی دیر وہ کھانا کھاتے رہے، عورت کی سانس ٹھنڈی اور گیلی ہوا میں نظر آتی رہی۔ مرد اس کی طرف دیکھ دیکھ کر سر ہلاتا رہا۔ وہ نہایت خاموشی سے کھانا کھا رہے تھے۔ مرد نے میز کے نیچے اس کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ وہ کافی حسین نظر آرہی تھی لیکن دونوں اداس تھے۔ ان کے پاس مسافروں کی طرح ایک بیگ بھی پڑا تھا۔

میں اخبار میں سے شنگھائی کی جنگ کے حالات پڑھ پڑھ کر گائے کو سنا رہا تھا۔ کھانے کے بعد وہ بیرے کے ساتھ کسی ایسی جگہ کی تلاش میں گیا جو ریستوران میں موجود نہ تھی۔ اس کی غیر موجودگی میں میں موٹر کا شیشہ، بتیاں اور لائسنس کے شیشے ایک کپڑے کی دھجی سے صاف کرتا رہا۔ گائے واپس آیا تو ہم نے کار نکال کر سٹارٹ کی۔ بیرا اُسے سڑک کے پار ایک پرانے مکان میں لے گیا تھا۔ گھر کے مکین اُسے مشتبہ نظروں سے دیکھتے تھے اس لئے بیرا اُس کے فارغ ہونے تک وہیں کھڑا رہا تاکہ کوئی چیز چوری نہ ہو جائے۔

"حالانکہ مجھے چوری کرنے کی الکل ہی نہیں، نل ساز عموماً چوری کرتے ہیں اور میں اس کام سے بالکل ناواقف ہوں، پھر بھی یہ لوگ ڈرتے تھے کہ میں کچھ چرا نہ لوں۔" گلائے نے بتایا۔ شہر سے نکل کر جب ہم ایک راس پر پہنچے تو ہوا کے تھپیڑے سے کار الٹتے الٹتے بچی۔

"شکر ہے کہ ہوا ہمیں سمندر سے پرے دھکیل رہی ہے۔" گلائے نے کہا۔

"تمہیں معلوم ہے۔" میں نے کہا "شیلے کو بھی یہیں کہیں ڈبویا گیا تھا۔"

"وہ تو نیچے وایاریگجیو کے قریب ڈوبا تھا۔" گلائے نے کہا "تمہیں یاد ہے ہم اس ملک میں کس لئے آئے تھے؟"

"ہاں یاد ہے۔" میں نے کہا "لیکن وہ بات تو ہمیں معلوم ہی نہ ہوئی۔"

"آج رات ہم اس ملک سے باہر ہو جائیں گے۔"

"ہاں اگر ہم ونٹی مِنکیبا سے نکل سکے۔"

"اچھا دیکھیں۔ میں رات کے وقت اس ساحل پر گاڑی چلانا نہیں چاہتا۔"

ابھی تیسرا پہر ہوا ہی تھا اور سورج باہر ہی تھا۔ نیچے نیلا سمندر پھیلا ہوا تھا۔ اور اس کی لہریں سوونا کی طرف بھاگی جا رہی تھیں۔ پیچھے کی طرف راس سے پرے گدلا اور نیلا پانی آپس میں مل رہے تھے۔ آگے ہمارے سامنے ایک دخانی جہاز ساحل کی طرف جا رہا تھا۔

"کیا جے نووا ابھی تک نظر آ رہا ہے؟" گلائے نے پوچھا۔

"ہاں، ابھی تک دکھائی دے رہا ہے۔"

"اگلی راس سے یہ نظر نہ آئے گا۔"

"ابھی تو کافی دیر تک نظر آتا رہے گا۔ ابھی تک مجھے راس پورٹو فائینو بھی نہ دکھائی دے رہی ہے جو اس سے بھی پرے ہے۔"

آخر جے نودا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو صرف سمندر ہی دکھائی دیتا تھا۔ اور اس میں مچھلیاں پکڑنے والی کشتیوں کی ایک قطار۔ اوپر پہاڑ کے اس رُخ پر ایک قصبہ نظر آ رہا تھا اور آگے ساحل سے نیچے کئی راسیں دکھائی دے رہی تھیں۔

"اب جے نودا دکھائی نہیں دیتا" میں نے گلاٹے سے کہا۔

"وہ تو دیر سے اوجھل ہو چکا ہوا ہے۔"

"لیکن جب تک ہم یہاں نہ پہنچ گئے مجھے یقین نہ تھا۔"

سڑک پر S کی شکل کا نشان لگا ہوا تھا جس سے سڑک کے موڑ کی صورت واضح کی گئی تھی۔ سڑک ایک تودے کے گرد مڑتی ہوئی نظر آ رہی تھی اور شیشے کی درز میں ہوا داخل ہو رہی تھی۔ آگے سمندر کے ساتھ کھلی فراخ جگہ تھی۔ ہوا سے مٹی سوکھ چکی تھی اور پہیوں سے دھول اُڑ رہی تھی۔ ہموار سڑک پر ہم ایک فاشسٹ کے پاس سے گذرے جو ایک بھاری پستول کندھے پر سے لٹکائے سائیکل پر جا رہا تھا۔ وہ سڑک کے درمیان میں چل رہا تھا اس لئے ہمیں کار بچا کر نکالنی پڑی۔ جب ہم اس کے پاس سے گذرے تو اس نے نظر بھر کر ہماری طرف دیکھا۔ آگے ریل کی پٹڑی سڑک کو کاٹتی تھی۔ جب ہم اس کے نزدیک پہنچے تو پھاٹک بند ہو گیا۔

ہم گاڑی کے گذرنے کا انتظار کر رہے تھے کہ فاشسٹ نے سائیکل پر ہمیں آ لیا۔ گاڑی گذر گئی تو گلاٹے نے موٹر کو چالو کیا۔

"ٹھہرو" سائیکل والے نے گرج کر کہا۔ "تمہاری نمبر کی تختی گندی ہے۔"

میں کپڑے کی ایک دھجی لے کر اُترا۔ میں نے اسے دوپہر کے کھانے کے وقت صاف کیا تھا۔

"یہ تو صاف پڑھا جاتا ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ پڑھنے کے قابل ہے؟"

"پڑھ کر دیکھ لو۔"

"مجھ سے نہیں پڑھا جاتا۔ یہ گندا ہے۔"

میں نے ڈیچی سے اسے صاف کر دیا

"اب ٹھیک ہے؟"

"پچیس لیرا"

"کس جرم میں؟" میں نے کہا۔ "یہ تو صاف پڑھا جاتا تھا۔ سڑکوں کی خراب حالت کی وجہ سے میلا ہو گیا ہے۔"

"تو تمہیں اٹلی کی سڑکیں ناپسند ہیں؟"

"ہاں گندی ہیں۔"

"پچاس لیرا" اُس نے سڑک پر تھوکتے ہوئے کہا۔ "تمہاری کار گندی ہے اور تم خود بھی گندے ہو۔"

"بہت اچھا، جرمانہ لے لو اور اپنے دستخطوں کے ساتھ اس کی رسید دو۔"

اس نے جیب سے ایک رسیدوں کی کتاب نکالی۔ اس کا آدھا حصہ رسید پھاڑ کر دینے کا تھا اور آدھا حصہ کتاب میں لگا رہتا تھا۔ جو حصہ رسید کے طور پر دیا جاتا تھا اس کی نقل کاربن کے ذریعے سے نہ رکھی جا سکتی تھی۔

"لاؤ پچاس لیرا۔"

اس نے پکّی پنسل سے رسید لکھ کر میرے حوالے کر دی۔ میں نے اسے پڑھ کر دیکھا۔

"یہ تو پچیس لیرا کی رسید ہے۔"

"غلطی ہو گئی" کہہ کر اس نے پچیس کاٹ کر پچاس لکھ دیا۔

"اب رسید کے دوسرے حصّے میں بھی تصحیح کرو۔ اپنے حصّے میں بھی پچاس لکھو"

وہ اطالویوں کے سے دلنواز انداز میں مسکرا دیا۔ اور رسید کے اپنے حصّے پر بھی کچھ لکھا لیکن میری نظر بچا کر۔

"اب جاؤ" اس نے کہا "اپنا نمبر دوبارہ گندا ہونے سے پہلے پہلے نکل جاؤ"

اندھیرا پھیلنے سے دو گھنٹے بعد تک بھی ہم نے اپنا سفر جاری رکھا اور اس رات مین ٹون پہنچ کر سوئے۔ یہ جگہ بڑی خوشگوار، صاف ستھری اور پیاری تھی۔ ہم ونٹی مگلیا سے پیسا اور فلورینس گئے تھے اور روما گنا سے گذر کر رمینی اور پھر والیسی میں فورلی، امولا، بولوگنا، پرما، پیاسنزا اور جے نودا سے ہوتے ہوئے واپس ونٹی مگلیا پہنچ گئے تھے۔ اس سارے سفر میں صرف دس دان خرچ ہوئے۔ قدرتی بات ہے کہ اس تھوڑے سے وقفے میں ہمیں اس ملک اور اس کے باشندوں کا حال معلوم کرنے کا موقع ہی نہ ملا تھا۔

بے خوابی

اُس رات ہم کمرے کے فرش پر لیٹے ہوئے تھے اور میں ریشم کے کیڑوں کے کھانے کی آواز سن رہا تھا۔ ریشم کے کیڑے شہتوت کے پتوں کو کھا رہے تھے اور ساری رات ان کے کھانے اور پتوں کے گرنے کی آواز آتی رہی۔ میں خود بھی سونا نہ چاہتا تھا کیونکہ کتنی دیر سے میرے سر میں یہ وہم سمایا ہوا تھا کہ اگر اندھیرے میں میری آنکھ لگ گئی اور مجھے اپنے آپ پر قابو نہ رہا تو میری روح جسم سے الگ ہو جائے گی۔ مدت سے میری یہی حالت تھی، اُس وقت سے جب ایک رات بم سے اُڑ کر میں دُور جا پڑا تھا اور مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے میری روح نکل گئی ہے لیکن پھر واپس آ کر جسم میں داخل ہو گئی۔ میں نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح اس کی یاد میرے ذہن سے نکل جائے۔ لیکن جب کبھی میری آنکھ نیند سے بند ہونے لگتی تو مجھے یہی احساس ہوتا کہ روح جسم سے الگ ہو رہی ہے اور پھر مجھے روح کو قابو میں رکھنے کے لئے بڑی جدوجہد کرنی پڑتی۔ اب مجھے اس بات کا کافی یقین ہو چکا ہے کہ اگر میں اُس وقت سو جاتا تو شاید روح نہ ہی

نکلتی لیکن اُس موسم گرما میں مَیں یہ تجربہ کرنے پر تیار نہ تھا۔

اس بے خوابی میں، اپنے آپ کو مشغول رکھنے کے لئے میں نے مختلف طریقے سوچ رکھے تھے۔ بچپن میں ایک ندی پر میں مچھلیاں پکڑا کرتا تھا، چنانچہ تصور ہی تصور میں اس ندی کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک میں نہایت توجہ سے مچھلیاں پکڑتا رہتا۔ ہر شہتیر کے نیچے، ہر موڑ پر، ہر گہرے پانی میں اور ہر پایاب موقع پر میں کبھی مچھلی قابو کر لیتا اور کبھی وہ قابو سے نکل جاتی۔ دوپہر کے وقت کھانا کھانے کے لئے میں شکار بند کر دیتا جسے کبھی تو شہتیروں کے ڈھیر میں بیٹھ کر کھاتا، کبھی کسی اونچے کنارے پر درختوں کی چھاؤں میں، لیکن میں ہمیشہ اپنا کھانا آہستہ آہستہ کھاتا اور ساتھ ساتھ ندی کے پانی کو بھی بڑے غور سے دیکھتا جاتا۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ کانٹے میں لگانے کے لئے طعمہ ختم ہو جاتا، کیونکہ میں تمباکو کے ڈبے میں صرف دس کیچوے لے جانے کا عادی تھا۔ اور جب یہ ختم ہو جاتے تو مجھے اور تلاش کرنے پڑتے۔ بعض اوقات ان کی تلاش میں بڑی دقت پیش آتی کیونکہ ندی کے کنارے پر اُگے ہوئے سایہ دار درخت گھاس نہ اُگنے دیتے جس کی وجہ سے گیلی مٹی تو ہوتی لیکن اس میں کیچوے نہ ملتے۔ مجھے کسی نہ کسی قسم کا طعمہ آخر مل ہی جاتا تھا لیکن ایک دفعہ کچھ نہ ملا۔ تو مجھے ایک شکار کی ہوئی مچھلی کاٹ کر کانٹے میں لگانی پڑی۔

بعض اوقات مجھے گھاس میں، دلدل میں یا دوسرے پودوں میں کسی نہ کسی قسم کے کیڑے مل جاتے جنہیں میں استعمال میں لے آتا۔ ان میں بھونرے بھی ہوتے تھے اور ایسے کیڑے بھی جن کی ٹانگیں گھاس کی پتیوں کی طرح ہوتی ہیں، پرانے گلے سڑے شہتیروں میں تتلیوں کے نیچے بھی مل جاتے تھے،

سفید سفید کیڑے جن کے سر کانٹے میں پروتے پروتے ٹوٹ جاتے تھے اور جب انہیں ندی کے ٹھنڈے پانی میں ڈالا جاتا تو کیڑا غائب ہو جاتا اور خالی کانٹا رہ جاتا۔ بعض شہتیروں کے نیچے جھینگر کی قسم کے کیڑے بھی ملتے لیکن جونہی لکڑی کو ہٹایا جاتا وہ زمین میں غائب ہو جاتے۔ ایک دفعہ ایک پرانے شہتیر کے نیچے مجھے ایک سمندر بھی ملا۔ یہ ٹڈا چھوٹا، چست چالاک اور پیارے رنگ کا تھا۔ اس نے اپنی چھوٹی چھوٹی ٹانگوں سے کانٹے کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اس کے بعد بھی مجھے سمندر ملتے رہے لیکن میں نے انہیں کبھی استعمال نہیں کیا۔ میں ٹڈیاں بھی استعمال نہ کیا کرتا تھا کیونکہ وہ کانٹے پر ٹھیک کام نہ دیتی تھیں۔

جہاں ندی کھلے سبزہ زار میں سے گذرتی تھی میں کبھی کبھی ٹڈے پکڑ کر لگا لیا کرتا تھا۔ بعض اوقات ٹڈا پکڑ کر میں یونہی پانی میں پھینک دیتا اور اسے پانی کی سطح پر بہتے اور چکر کاٹتے ہوئے دیکھتا رہتا یہاں تک کہ کوئی مچھلی اسے دیکھ کر نگل جاتی۔ اور کبھی میں ایک ہی رات میں چار پانچ ندیوں پر شکار کر لیتا۔ میں ان کے منبع سے شروع کرتا اور اس کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ شکار کرتا ہوا چل پڑتا۔ اگر ندی جلدی ختم ہو جاتی اور وقت کافی نہ گذرتا تو میں پھر اوپر کی طرف چلنا شروع کر دیتا اور راستے میں جہاں جہاں کوئی مچھلی میرے قابو سے نکل گئی ہوتی، اسے دوبارہ پکڑنے کی کوشش کرتا۔ بعض راتوں کو میں صرف اوپر کی طرف ہی شکار کرتا اس میں بڑا لطف آتا اور یوں محسوس ہوتا جیسے میں جاگتے میں خواب دیکھ رہا ہوں ان میں سے بعض ندیاں تو مجھے اس طرح یاد ہیں جیسے میں نے سچ مچ ان میں شکار کیا ہے اور کچھ جن ندیوں کو میں سچ مچ پا تا ہوں۔ ان میں یہ ایسی خلط ملط ہو جاتی ہیں کہ الگ پہچاننی مشکل ہو جاتی ہیں۔

میں نے ہر ندی کا ایک نام رکھا ہوا تھا اور پھر اپنے تصور ہی میں، گاڑی میں بیٹھ کر وہاں جایا کرتا تھا۔ بعض اوقات میلوں پیدل بھی چلتا تھا۔ بعض راتیں ایسی بھی آتی تھیں کہ میں ان میں مچھلی کا شکار نہ کر سکتا تھا۔ بس آنکھیں کھولے پڑا رہتا اور دعائیں مانگتا رہتا۔ میں ہر اُس شخص کے لئے دعا کیا کرتا تھا جس سے کبھی بھی میری شناسائی ہوئی تھی۔ اس میں کافی وقت لگتا تھا۔ کیونکہ اگر زندگی میں پیچھے کی طرف ہر اُس شخص کے متعلق سوچا جائے جس سے کبھی شناسائی ہو اور انسان اُس ابتدائی چیز تک پہنچ جائے۔ جو اُسے یاد ہو۔ میرے ذہن میں کمپریل کی چھت کا وہ سب سے اُوپر کا کمرہ آجاتا تھا جس میں میں پیدا ہوا تھا۔ اور میری ماں اور باپ کی شادی کا کیک۔ جو ایک ٹین کے ڈبے میں پڑا چھت کی ایک کڑی سے لٹکا ہوتا۔ اور اسی کمرے میں شیشے کی بوتلیں قطاروں میں نظر آتیں جن میں میرے باپ نے بچپن میں سانپ اور دوسرے جانور پکڑ پکڑ کر الکوحل میں محفوظ کر رکھے تھے۔ بوتلوں میں سے الکوحل اُڑ کر کم ہو گئی تھی اور بعض کیڑوں کی پشتیں ننگی نظر آتیں اور سفید ہو گئی ہوتیں —— جب تصور یہاں تک پہنچ جائے تو بہت سے آدمی یاد آ جاتے ہیں۔ اگر آپ ہر ایک کے لئے دعائے مریمؑ یا دعائے عیسےٰؑ دہرائیں تو اس میں اتنا وقت لگ جاتا ہے کہ رات گذر کر دن چڑھ جائے۔ اور دن کی روشنی میں میں آسانی کے ساتھ سو سکتا تھا بشرطیکہ وہ جگہ دن کے وقت سونے کے لئے موزوں ہو۔

ایسی راتوں میں میں ہر وہ واقعہ یاد کرنے کی کوشش کیا کرتا جو جنگ میں بھرتی ہوتے۔ پہلے مجھ پر گذرا ہوتا، اور پھر ایک واقعہ

سے دوسرے واقعے کو سلسلہ وار یاد کرتا چلا جاتا۔ مجھے معلوم ہوا کہ اس طرح پیچھے کی طرف سوچنے سے میں ہمیشہ اپنے دادا کے کھپریل کی چھت والے مکان تک پہنچ جایا کرتا۔ پھر میں وہاں سے شروع کر کے واپس جنگ میں بھرتی ہونے کے وقت تک تمام واقعات کو دہراتا۔

مجھے یاد ہے کہ دادا کی موت کے بعد ہم ایک نئے گھر میں اُٹھ آئے جو میری ماں نے بنوایا تھا۔ بہت سی چیزیں جو ہم نئے گھر میں نہ لانا چاہتے تھے اکٹھی کر کے پائیں باغ میں جمع کیں اور ان میں آگ لگا دی۔ وہ سانپوں اور کیڑوں والی بوتلیں بھی آگ کی نذر کر دی گئیں۔ بوتلیں بھک سے پھٹتیں اور الکحل کی وجہ سے آگ اور بھڑک اُٹھتی۔ پائیں باغ میں سانپوں کا جلنا مجھے آج تک یاد ہے۔ لیکن اس آگ میں انسان نہیں بلکہ مردہ کیڑے جل رہے تھے۔ مجھے یہ تو یاد نہیں کہ ان چیزوں کو آگ کس نے لگائی تھی لیکن خیالات کے سلسلے میں جب میں انسانوں کے جلنے تک پہنچتا تو اُن کے لئے دعائیں کرنا شروع کر دیتا۔

نئے مکان کے متعلق مجھے یہ یاد ہے کہ میری ماں کس طرح سامان کی جھاڑ پونچھ میں لگی رہتی اور ہر وقت مکان کو صاف ستھرا رکھنے کی کوشش کرتی رہتی۔ ایک دفعہ جب میرا باپ شکار پر گیا ہوا تھا تو اُس نے تہہ خانے کی صفائی کر کے تمام نامرغوب چیزوں کو اکٹھا کر کے آگ لگا دی میرا باپ شکار سے واپس آیا تو اس نے بگھی سے اتر کر گھوڑا کھولا۔ آگ ابھی تک گھر کی دیوار کے ساتھ سڑک کے کنارے جل رہی تھی۔ میں دوڑتا ہوا باپ کے پاس آیا۔ اس نے مجھے بندوق پکڑائی اور آگ کی طرف دیکھ کر پوچھنے لگا "یہ کیا ہے؟" میری اماں نے برآمدے میں سے آواز دی "میں نے تہہ خانے کی صفائی

کی ہے پیارے!" میری ماں مسکراتے ہوئے اُس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ باپ نے آگ پر نظر ڈالی اور پاؤں سے ٹھوکر مار کر کسی چیز کو نکالا۔ پھر اس نے جُھک کر راکھ میں سے کوئی چیز اُٹھائی "نِک ذرا کریدنی اُٹھا لانا" اس نے مجھے آواز دی۔ میں تہ خانے سے کریدنی لے آیا تو میرے باپ نے بڑے غور کے ساتھ آگ میں سے کچھ ڈھونڈنا شروع کیا۔ اور پھر پتھر کی کلہاڑیاں، اور کھال اُتارنے والے پتھر کے چاقو، مٹی کے برتنوں کے کچھ ٹکڑے اور تیروں کی اَنیاں نکالیں۔ یہ سب چیزیں آگ سے کالی ہو گئی تھیں۔ باپ نے یہ سب چیزیں نکال کر بڑی احتیاط سے سڑک کے کنارے گھاس پر پھیلا دیں۔ اس کی بندوق چمڑے کے تھیلے میں لپٹی ہوئی اور شکار کئے ہوئے جانوروں کا تھیلا ابھی تک گھاس پر اسی جگہ پڑا تھا جہاں اس نے انہیں گاڑی سے اُترتے وقت رکھا تھا۔

"شکار کے تھیلے اور بندوق اندر لے جاؤ نِک اور ایک بڑا سا کاغذ لے آؤ۔" میری ماں گھر کے اندر جا چکی تھی۔ میں نے بھاری بندوق اور تھیلے اُٹھا لئے۔ بندوق بار بار میری ٹانگوں سے ٹکرا رہی تھی۔ "بیٹے ایک ایک چیز کر کے اُٹھاؤ، ساری چیزیں ایک دم اٹھانے کی کوشش نہ کرو۔" میں نے شکار کے تھیلے رکھ دئے اور پہلے بندوق لے گیا اور باپ کے دفتر سے ایک اخبار بھی اٹھا لایا۔ میرے باپ نے پتھر کی ساری کالی اور جھبیں اُتری ہوئی چیزیں کاغذ پر رکھ کر لپیٹ دیں۔ "تیروں کی بہترین انیاں ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی ہیں۔" اس نے افسوس کے ساتھ کہا۔ یہ چیزیں لے کر وہ گھر میں داخل ہو گیا اور میں گھاس پر تھیلوں کے پاس کھڑا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں انہیں اندر اٹھا لے گیا۔ اس سارے واقعے میں صرف دو آدمی

مجھے یاد آئے چنانچہ ان کے لئے بھی میں نے دعا کی۔

بعض راتوں کو مجھے پوری دعا بھی یاد نہ رہتی "زمین پر بھی اسی طرح جیسے آسمان میں ہے۔" اس سے آگے مجھے دعا بھول جاتی اور میں پھر ابتدا سے دہرانا شروع کر دیتا۔ جب مجھے اس بات کا یقین ہو جاتا کہ اب مجھے کسی طرح پوری دعا یاد نہ آئے گی، تو میں اسے چھوڑ کر کسی اور بات میں مشغول ہو جاتا۔ چنانچہ بعض راتوں کو میں دنیا کے سارے حیوانات کو نام لے لے کر یاد کرتا، پھر پرندوں کو اور پھر مچھلیوں کو، پھر ملکوں اور ان کے شہروں کو، پھر تمام اقسام کے کھانوں کو، شکاگو کی تمام گلیوں اور بازاروں کو اور جب کوئی اور چیز باقی نہ رہتی تو میں کان لگا کر سننا شروع کر دیتا۔ مجھے ایسی راتوں میں سے ایک بھی رات ایسی یاد نہیں جب کسی نہ کسی چیز کی آواز نہ آرہی ہو۔ اگر رات کے وقت روشنی میسر ہوتی تو مجھے سونے سے ڈر نہ آتا کیونکہ میرا خیال تو یہ تھا کہ صرف اندھیرے میں سونے سے میری روح نکلتی ہے۔ بہت سی راتیں میں ایسی جگہ گذارا کرتا تھا جہاں روشنی ہو اور روشنی میں میں ہمیشہ سو جایا کرتا تھا۔ نیند اور تکان کا احساس تو مجھے ہر وقت رہتا تھا۔ بعض اوقات میری بے خبری میں اندھیرا ہو جاتا تو میں سویا ہی رہتا لیکن جب مجھے اندھیرے کا علم ہوتا تو میں ہرگز نہ سو سکتا تھا۔ اور آج رات میں اندھیرے میں ریشم کے کیڑوں کی آواز سن رہا تھا۔ رات کے وقت ریشم کے کیڑوں کے کھانے کی آواز صاف سنائی دیتی ہے میری آنکھیں کھلی تھیں اور میں ان کی آواز باقاعدہ سن رہا تھا۔

میرے علاوہ کمرے میں ایک اور آدمی بھی جاگ رہا تھا۔ میں دیر تک اس کی بیداری کو محسوس کرتا رہا۔ اسے میری طرح خاموشی سے جاگنے کی

مشق نہ تھی اس لئے وہ بار بار کروٹیں بدل رہا تھا۔ ہم نے گھاس پر کمبل بچھا رکھے تھے۔ جب وہ کروٹ لیتا تو گھاس میں سرسراہٹ پیدا ہوتی لیکن کیڑے اس آواز سے ڈرتے نہیں تھے۔ وہ اسی طرح باقاعدگی سے کھاتے رہتے۔ ہمارے پڑاؤ سے سات کلومیٹر پیچھے سے بھی آوازیں بلند ہو رہی تھیں لیکن وہ اس کمرے کی تاریکی میں ہلکی ہلکی سنائی دینے والی آوازوں سے مختلف تھیں۔ اس کمرے کے دوسرے مکین نے خاموش رہنے کی بڑی کوشش کی لیکن وہ پھر ہلا۔ میں نے بھی اس خیال سے کروٹ بدلی کہ اسے میری بیداری کا علم ہو جائے۔ اس نے دس سال تسکاگو میں گذارے تھے۔ ۱۹۱۴ء میں جب وہ اپنے اہل وعیال سے ملنے کے لئے واپس آیا تو اسے فوجی سمجھ کر بھرتی کر کے بطور اردلی میرے سپرد کر دیا گیا تھا۔ کیونکہ وہ انگریزی بول سکتا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ میری حرکت کو سن رہا ہے اس لئے میں نے پھر کروٹ بدلی۔

"ٹینینٹے صاحب، آپ کو نیند نہیں آ رہی؟"

"نہیں۔"

"میں بھی نہیں سو سکا۔"

"کیوں کیا بات ہے؟"

"معلوم نہیں، لیکن ایک لمحے کے لئے بھی آنکھ نہیں لگی۔"

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"ہاں؛ طبیعت تو بالکل ٹھیک ہے۔ بس نیند نہیں آتی۔"

"کیا باتیں کرنا چاہتے ہو؟" میں نے پوچھا

"جی تو چاہتا ہے، لیکن یہ ایسی کمبخت جگہ ہے کہ کوئی بات بھی

نہیں سوجھی۔"

"جگہ تو کافی اچھی ہے۔" میں نے کہا

"ہاں، ٹھیک ہی ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"اپنے شکاگو کی کوئی بات کرو۔"

"وہ تو ساری باتیں میں آپ کو بتا چکا ہوں۔"

"یہ بتاؤ کہ تمہاری شادی کیسے ہوئی تھی۔"

"یہ قصہ بھی میں آپ کو سنا چکا ہوں۔"

"یہ سوموار کو جو خط تمہارے نام آیا تھا۔۔۔ اُسی کا تھا؟"

"ہاں اُسی کا تھا۔ وہ مجھے اکثر خط لکھتی رہتی ہے۔ خوب پیسے کما رہی ہے۔"

"جب تم واپس جاؤ گے تو تمہارے کام میں خوب ترقی ہو چکی ہو گی۔"

"ہاں، وہ بڑی قابلیت سے چلا رہی ہے۔ اور اچھے پیسے بنا رہی ہے۔"

"ہمارے بولنے سے اِن کی نیند تو خراب نہ ہو گی؟" میں نے پوچھا

"نہیں تو، یہ ہماری باتیں نہیں سن رہے ہے۔ گھوڑے بیچ کر سوتے ہیں۔ میری بات دوسری ہے،" اس نے کہا۔ "میرے اعصاب کمزور ہیں اور طبیعت بے چین۔"

"ذرا آہستہ بولو۔" میں نے کہا۔ "سگرٹ پیو گے؟"

ہم اندھیرے میں بڑی احتیاط سے سگرٹ پیتے رہے۔

"ٹیننٹے صاحب! آپ بہت کم سگرٹ پیتے ہیں۔"

"نہیں، میں نے خود ہی کم کر دئے ہیں۔"

"میرے خیال میں تمباکو نوشی بے فائدہ سی چیز ہے۔ اب آپ کو اس کی پروا کبھی نہیں ہوتی ہوگی۔ آپ نے سنا ہے کہ اندھے آدمی سگرٹ نہیں پیتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ دھوئیں کو دیکھ نہیں سکتے؟"

"میں اس بات کو نہیں مانتا۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے کہ یہ بات یوں ہی مشہور ہوگئی ہوئی ہے۔ لیکن میں نے یہ بات کہیں سے سنی تھی۔ لوگ تو بس یونہی باتیں مشہور کر دیتے ہیں۔"

ہم دونوں خاموش ہو گئے اور ریشم کے کیڑوں کی آواز سننے لگے۔

"آپ کو ان کیڑوں کی آواز آ رہی ہے؟" اس نے پوچھا۔ "ان کے پتے چبانے کی آواز آتی ہے۔"

"ہاں کتنی عجیب بات ہے۔" میں نے کہا۔

"ٹیننٹے صاحب! آپ کے نیند نہ آنے کی کوئی خاص وجہ ہے؟ میں نے کبھی آپ کو سوتے ہوئے نہیں دیکھا۔ جب سے میں آپ کے پاس آیا ہوں متواتر کئی راتوں سے آپ نہیں سوئے۔"

"وجہ تو معلوم نہیں جان، ہاں پچھلے موسم بہار میں مجھے ایک حادثہ پیش آ گیا تھا بس اسی کی یاد مجھے تنگ کرتی رہتی ہے۔"

"بالکل میرے والا معاملہ ہے صاحب۔ مجھے اس جنگ میں شریک نہ ہونا چاہیئے تھا۔ میرے اعصاب خراب ہو رہے ہیں۔"

"آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جاؤ گے۔" میں نے کہا۔

"اچھا ٹیننٹے صاحب، یہ تو بتائیے کہ آپ کس خیال سے اس جنگ میں شامل ہوئے ہیں؟"

"معلوم نہیں جان، بس یہی ہوگا کہ اُس وقت میرا دل یہی چاہتا ہوگا۔"

"یہ دل چاہنے والی بات۔ تو عجیب قسم کی وجہ ہے۔"

"ذرا آہستہ بولو، جان۔"

"یہ تو سوروں کی طرح گہری نیند سو رہے ہیں۔" اس نے کہا۔ "اور پھر یہ انگریزی بھی نہیں سمجھتے۔ بالکل نہیں سمجھ سکتے۔ اچھا صاحب! جب آپ واپس امریکہ جائیں گے تو کونسا شغل اختیار کرنے کا خیال ہے؟"

"میں کسی اخبار کے دفتر میں کام کروں گا۔"

"شکاگو میں؟"

"شاید شکاگو ہی میں کروں۔"

"کیا آپ ربیبن کے مضمون پڑھتے ہیں؟ میری بیوی ان کے تراشے مجھے بھیجتی رہتی ہے۔"

"ہاں پڑھتا ہوں۔"

"کیا آپ کبھی اس سے ملے بھی ہیں؟"

"ملا تو نہیں لیکن میں نے اسے دیکھا ہوا ہے۔"

"میں اس شخص سے ملنا چاہتا ہوں۔ بڑا اچھا لکھتا ہے۔ میری بیوی انگریزی نہیں پڑھ سکتی۔ لیکن وہ اسی طرح اخبار لیتی ہے جس طرح میں لیا کرتا تھا۔ پھر اخبار میں سے اداریہ اور کھیلوں کا صفحہ کاٹ کر مجھے بھیج دیتی ہے۔"

"تمہارے بچے کیسے ہیں؟"

"ٹھیک ہیں۔ ایک لڑکی اب چوتھی جماعت میں تعلیم پا رہی ہے۔ آپ جانتے ہیں ٹینینٹے صاحب! اگر میرے بچے نہ ہوتے تو میں آج آپ کا اردلی نہ ہوتا۔ مجھے گھر آنے کی اجازت ہی نہ ملتی۔"

"مجھے تو اس بات کی خوشی ہے کہ تمہارے بچے بھی ہیں۔"

"خوشی تو مجھے بھی ہے۔ بڑے خوبصورت بچے ہیں۔ لیکن تینوں ہی لڑکیاں اور لڑکا کوئی بھی نہیں۔ بڑی بدمزگی کی بات ہے۔"

"تم ذرا کوشش کر کے سو کیوں نہیں جاتے؟"

"نہیں ٹیننٹے صاحب! اب نیند نہ آئے گی۔ اب تو پوری طرح اُچاٹ ہو گئی ہے۔ مجھے آپ کے نہ سونے کا بڑا فکر رہتا ہے۔"

"فکر کی کوئی بات نہیں جان۔ آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جاؤں گا۔

"ذرا خیال تو کرو، آپ جیسا جوان آدمی اور اُسے نیند نہ آئے۔

"آپ ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ اس تکلیف کو رفع ہوتے کچھ دیر ہی لگتی ہے۔

"آپ کو جلد ٹھیک ہو جانا چاہیئے۔ جاگتے رہنے سے گذارہ نہ ہوگا۔ آپ کو کسی بات کا فکر ہے؟ آپ کے دل پر کوئی بوجھ ہے؟"

"نہیں جان، ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

"آپ کو شادی کر لینا چاہیئے صاحب، آپ کے تفکرات دور ہو جائیں گے۔"

"ممکن ہے۔"

"شادی ضرور کر لیجئے۔ آپ کسی بھلی سی اٹلی کی لڑکی سے شادی کر لیں جس کے پاس بہت سی دولت ہو۔ آپ تو جس لڑکی سے چاہیں شادی کر سکتے ہیں۔ آپ جوان بھی ہیں اعلیٰ عہدیدار بھی ہیں اور خوبصورت بھی۔ آپ دو مرتبہ زخمی بھی ہو چکے ہیں۔"

"مجھے اٹلی کی زبان اچھی طرح بولنی بھی نہیں آتی۔"

"آپ کافی اچھی طرح بول لیتے ہیں۔ زبان میں ماہر نہ ہونے تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ اور آپ کو اتنا بولنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ بس شادی کر لیجئے۔"

"میں اس معاملے پر غور کروں گا۔"

"آپ کچھ لڑکیوں سے واقف بھی ہوں گے، ہیں ناں؟"

"ہاں۔"

"بس جو ان میں سب سے زیادہ امیر ہے اُس سے شادی کر لیجئے۔ اس ملک میں ان کی تربیت ایسی ہوتی ہے کہ بڑی اچھی بیوی ثابت ہو سکتی ہیں۔"

"میں اس معاملے پر غور کروں گا۔"

"اس میں سوچنے والی کونسی بات ہے ٹیننٹے صاحب۔ بس شادی کر لیجئے۔"

"بہت اچھا۔"

"مرد کو شادی کر ہی لینی چاہیئے۔ آپ اس بات پر کبھی نہ پچھتائیں گے۔ ہر مرد کے لئے شادی کرنا ازبس ضروری ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" میں نے کہا۔ "آؤ اب تھوڑی دیر کے لئے سو رہیں۔"

"بہت اچھا ٹیننٹے صاحب۔ میں ایک دفعہ پھر کوشش کرتا ہوں لیکن جو بات میں نے کہی ہے اسے یاد رکھئے۔"

"میں اسے یاد رکھوں گا" میں نے کہا۔ "آؤ جان اب تھوڑی دیر کے لئے سو رہیں۔"

"بہت اچھا" اس نے جواب دیا۔ "خدا کرے صاحب آپ کو بھی نیند

آجائے۔"

وہ گھاس پر کمبل لپیٹ کر خاموشی سے لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کے باقاعدہ سانس لینے کی آواز آنے لگی۔ پھر اس نے خراٹے لینے شروع کر دئے۔ میں دیر تک اس کے خراٹوں کی آواز سنتا رہا، پھر میں نے اس طرف توجہ دینا چھوڑ دی اور ریشم کے کیڑوں کے کھانے کی آواز سننے لگا۔ وہ باقاعدہ کھاتے رہے اور پتوں میں گرتے رہے۔ میرے لئے سوچنے کا ایک نیا موضوع پیدا ہو گیا تھا۔ میں ان تمام لڑکیوں کے متعلق سوچنے لگا جنہیں میں جانتا تھا اور یہ سوچنے لگا کہ ان میں بیوی بننے کی اہلیت کتنی موجود ہے۔ یہ بڑا دلچسپ موضوع تھا۔ میں کچھ عرصے کے لئے مچھلیوں کا شکار اور دعائیں مانگنا بھول گیا لیکن آخر میں نے تنگ آکر مچھلیوں کے شکار کی طرف رجوع کر لیا۔ کیونکہ مجھے تمام ندیاں یاد تھیں اور ہر مرتبہ ان میں کوئی نہ کوئی نئی بات پیدا ہو جاتی۔ حالانکہ لڑکیوں کے متعلق جب میں چند ایک مرتبہ سوچ چکا تو ان کی شکلیں دھندلانے لگیں اور آخر سب ایک ہی قسم کی ہو گئیں۔ میں نے ان کے متعلق سوچنا ہی چھوڑ دیا۔ میں نے دعائیں مانگنا پھر شروع کر دیں۔ اور ان میں میں جان کے لئے اکثر دعائیں کیا کرتا تھا۔ اکتوبر کے حملے سے پہلے ان لوگوں کو محاذ جنگ سے تبدیل کر دیا گیا تھا۔ شکر ہے کہ وہ اس موقع پر موجود نہ تھا ورنہ مجھے اس کا بڑا فکر رہتا۔ کئی مہینے بعد وہ مجھے میلان کے ہسپتال میں ملنے کے لئے آیا اور یہ دیکھ کر اسے بڑی مایوسی ہوئی کہ میں نے ابھی تک شادی نہ کی تھی۔ میں جانتا تھا کہ اسے یہ معلوم کر کے بڑا صدمہ ہو گا۔ وہ امریکہ جا رہا تھا۔ اسے پختہ یقین تھا کہ شادی کرنے کے بعد میری ساری تکلیف دور ہو جائے گی۔

غریب الوطنی میں

خزاں آئی اور جنگ اُسی طرح جاری رہی، لیکن اب ہم محاذِ جنگ پر نہ گئے۔ اس خزاں میں میلان میں شدّت کی سردی پڑ رہی تھی اور دن بڑی جلدی ڈوب جاتا تھا۔ پھر بجلی کی روشنی ہو جاتی اور گلیوں بازاروں میں کھڑکیاں اور دروازے جگمگ کرنے لگتے۔

دوکانوں کے باہر شکار کئے ہوئے جانور سینکڑوں کی تعداد میں لٹکے ہوئے تھے۔ لومڑیوں کی کھالیں برف سے سفید ہو رہی تھیں اور اُن کی دُمیں ہوا میں لہرا رہی تھیں۔ ہرن اکڑے ہوئے، بھاری اور خالی ٹنگے ہوتے تھے اور چھوٹے چھوٹے پرندے ہوا سے جھوم رہے تھے اور اُن کے پر لٹے ہو ہو جاتے تھے۔ یہ خزاں کا موسم بڑا ہی سرد تھا کیونکہ ہوا پہاڑیوں کی طرف سے آرہی تھی۔

ہر روز تیسرے پہر ہم ہسپتال میں اکٹھے ہو جاتے تھے۔ شام کے دھندلکے میں شہر کو طے کر کے ہسپتال تک پہنچنے کے کئی راستے تھے۔ دو راستے نہروں کے کنارے کنارے بھی تھے لیکن وہ بڑے لمبے تھے

ہسپتال میں داخل ہونے کے لئے نہر کا کوئی نہ کوئی پل عبور کرنا پڑتا تھا تین پلوں میں سے کسی ایک کو عبور کر لیجئے۔ ایک پل پر ایک عورت بھنے ہوئے چیسٹ نٹ بیچا کرتی تھی۔ اس کی دہکتی ہوئی انگیٹھی کے سامنے کھڑے ہونے میں بڑا مزا آتا تھا اور پھر گرم گرم چیسٹ نٹ جیب میں ڈالنے سے بڑی راحت ہوتی تھی۔ ہسپتال بڑا پرانا اور بڑا خوبصورت تھا۔ ایک دروازے سے داخل ہو کر بیچ صحن عبور کرنا پڑتا تھا اور پھر دوسری طرف باہر جانے کا دروازہ تھا۔ صحن میں سے عموماً جنازے اٹھتے رہتے۔ پرانے ہسپتال سے پرے اینٹوں سے بنے ہوئے نئے پویلین تھے۔ یہیں ہم روزانہ تیسرے پہر اکٹھے ہو کر ایک دوسرے کے دکھ درد کا حال بڑی ہمدردی سے پوچھا کرتے تھے اور ان مشینوں پر بیٹھ جاتے تھے جو ہمارے اعضاء کو درست کرنے والی تھیں۔

ڈاکٹر اس مشین کے پاس آیا جس پر میں بیٹھا تھا اور بولا "جنگ سے پہلے تمہارا سب سے زیادہ پسندیدہ مشغلہ کیا تھا؟ کوئی کھیل بھی کھیلا کرتے تھے؟"

میں نے کہا "ہاں، فٹ بال کھیلتا تھا۔"

"بہت خوب" اس نے کہا "تم پہلے سے بھی اچھی طرح فٹ بال کھیلنے کے قابل ہو جاؤ گے۔"

میرا گھٹنا خم نہ کھا سکتا تھا۔ میری ٹانگ گھٹنے سے پنڈلی تک بالکل سیدھی تھی اور اس مشین سے اس طرح خم پیدا کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی جیسے ٹرائیسکل چلاتے وقت ٹانگوں کو حرکت دی جاتی ہے لیکن میرا گھٹنا چونکہ خم نہ کھا سکتا تھا اس لئے مشین کا خم دینے والا

حصہ چھوٹا ہوتا جاتا تھا۔ ڈاکٹر بولا "یہ سب آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گا۔ تم بڑے خوش قسمت نوجوان ہو۔ دیکھ لینا، تم فٹ بال کے چمپین بن جاؤ گے۔"

دوسری مشین پر ایک میجر بیٹھا تھا جس کا ایک ہاتھ بچّوں کی طرح چھوٹا سا تھا۔ چمڑے کی دو پٹیاں اس کی اکڑی ہوئی انگلیوں پر نیچے اوپر سے اس انداز سے لپٹتی اور کھنچی جاتی تھیں کہ ان کے جوڑوں میں لچک پیدا ہو جائے۔ جب ڈاکٹر اس کے ہاتھ کا معائنہ کرنے لگا تو اس نے مجھے آنکھ مارتے ہوئے ڈاکٹر سے پوچھا "کیوں کپتان صاحب، میں بھی فٹ بال کھیل سکوں گا یا نہیں؟"

وہ ایک مشہور تیغ زن تھا اور جنگ سے پہلے اٹلی میں کوئی اس کا ثانی نہ تھا۔

ڈاکٹر پچھلی طرف اپنے کمرے میں گیا اور ایک تصویر اٹھا لایا جس میں ایک آدمی کا ہاتھ سوکھ کر اتنا ہی چھوٹا ہو گیا ہوا تھا جتنا کہ میجر کا ہاتھ تھا، اور مشین کے باقاعدہ استعمال کے بعد وہ کسی قدر بڑا ہو گیا تھا۔ میجر نے اپنے صحیح ہاتھ میں وہ تصویر پکڑ لی اور بڑے غور سے دیکھنے لگا۔ "زخمی ہوا تھا؟" اس نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

"ہاں، کارخانے میں حادثہ پیش آگیا تھا۔" ڈاکٹر نے بتایا۔

"بڑی دلچسپ چیز ہے۔ بڑی ہی دلچسپ چیز ہے۔" میجر نے کہا اور تصویر ڈاکٹر کو واپس دے دی۔

"آپ کو اپنے علاج پر اعتماد ہو گیا ہے نا؟"

"نہیں" میجر نے جواب دیا۔

میری ہی عمر کے تین اور لڑکے بھی تھے جو روزانہ علاج کے لئے آیا کرتے تھے۔ یہ تینوں میلان ہی کے باشندے تھے۔ ان میں سے

ایک وکیل بننے والا تھا، ایک مصور اور تیسرے کا ارادہ سپاہی بننے کا تھا۔
جب ہم سب مشینوں پر ورزش کر چکتے تو بعض اوقات ٹہلتے ہوئے
کافے کووا اینک جا نکلتے جو سکالا سے ملحق تھا۔ ہم چاروں اکٹھے ہوتے تھے۔
اس لئے کمیونسٹوں کی آبادی میں سے گذرنے میں کوئی مضائقہ نہ سمجھتے تھے۔
یہ لوگ ہم سے صرف اس لئے متنفر تھے کہ ہم افسر تھے۔ ایک اور لڑکا بھی
کبھی کبھی ہمارے ساتھ شامل ہو جایا کرتا تھا اور اس طرح ہم پانچ بھی ہو جاتے
تھے۔ وہ سیاہ رنگ کا ریشمی رومال اپنے چہرے پر ڈالے رکھتا تھا کیونکہ
اس کی ناک ضائع ہو چکی تھی اور ہسپتال میں دوبارہ بننے والی تھی۔ وہ فوجی
اسکول سے سیدھا محاذ جنگ پر بھیجا گیا تھا اور لڑائی میں شامل ہونے کے
گھنٹہ بھر بعد زخمی ہو کر واپس آگیا تھا۔ ڈاکٹروں نے اس کا منہ دوبارہ بنایا
لیکن وہ ایک پرانے معزز خاندان کا فرد تھا اور اس کی ناک صحیح طور پر نہ بن
سکی۔ وہ جنوبی امریکہ کے ایک بنک میں کام کرنے کے لئے چلا گیا تھا۔
لیکن یہ بڑی دیر کی بات ہے۔ اُس وقت ہم میں سے کسی کو بھی معلوم نہ تھا
کہ آئندہ کیا پیش آنے والا ہے۔ ہمیں صرف یہی معلوم تھا کہ جنگ جاری
ہے لیکن ہمیں اب اس میں شامل نہیں ہونا۔

ہم میں سے ہر ایک کو ایک ہی قسم کے تمغے ملے ہوئے تھے سوائے
اُس لڑکے کے جس کے منہ پر سیاہ ریشم کی پٹی بندھی رہتی تھی۔ وہ
جنگ میں اتنی مدت نہ رہا تھا کہ اسے بھی کوئی تمغہ ملتا۔ وہ لمبے قد کا لڑکا
جس کا رنگ بڑا زرد تھا اور جو وکیل بننے والا تھا ارڈیٹی کا لفٹیننٹ
تھا۔ اس کے پاس تین ایسے تمغے تھے جس قسم کا ہمارے پاس ایک ایک
تھا۔ وہ بڑی دیر تک موت کی فضا میں رہنے کی وجہ سے ہر چیز سے

کچھ بے تعلق سا ہو گیا ہوا تھا - اور ویسے تو ہم سبھی کسی حد تک بے تعلق ہی سے تھے. ہم میں باہمی تعلق پیدا کرنے والی بات بھی کوئی نہ تھی سوائے اس کے کہ ہمیں ہر روز تیسرے پہر ہسپتال میں ایک دوسرے سے ملنا پڑتا تھا - لیکن اس بے تعلقی کے باوجود جب ہم رات کی تاریکی میں، شہر کی او باش آبادی میں سے گذرتے جہاں ہر طرف شراب کی دوکانوں میں سے روشنی اور گانے کی آواز نکل رہی ہوتی اور جہاں بعض اوقات پیدل راستے پر لوگوں کی اتنی بھیڑ لگی ہوتی کہ ہمیں بڑی مشکل سے راستہ ملتا، تو ہم اپنے آپ کو کسی ایسے رشتے میں منسلک پاتے، جسے وہ لوگ جو ہم سے نفرت کرتے تھے، کسی طرح سمجھ نہ سکتے تھے۔

ہم سب کے سب کووا کی فضا کو بڑی اچھی طرح سمجھتے تھے جو بڑی پر آسائش اور گرم ہوتی تھی، روشنی زیادہ تیز نہ ہوتی تھی، دن کے بعض حصوں میں شور و غوغا اور دھواں بھی ہوتا ہر وقت لڑکیاں میزوں پر موجود رہتیں اور دیوار کے ساتھ ساتھ الماریوں میں مصور رسالے پڑے رہتے - کووا کی لڑکیاں بڑی وطن پرست تھیں اور میں نے یہ اندازہ کیا کہ اٹلی کے باشندوں میں سے جو لوگ سب سے زیادہ وطن پرست ہیں وہ یہی ہوٹلوں کی لڑکیاں ہیں —— اور مجھے یقین ہے کہ اب بھی وہ ویسی ہی وطن پرست ہوں گی۔

شروع شروع میں لڑکے بڑے احترام سے میرے تمغوں کے متعلق پوچھا کرتے تھے کہ کن کارناموں کے پیش نظر مجھے ملے ہیں - میں انہیں کاغذات دکھاتا جن میں بڑی خوبصورت زبان میں میری دلیری اور بہادری کا ذکر درج تھا لیکن حقیقت میں اسمائے صفت نکال لینے کے بعد ان کا یہی مطلب رہ جاتا تھا کہ مجھے یہ تمغے صرف اس لئے ملے ہیں کہ میں امریکی ہوں - اس کے بعد

میرے ساتھ اُن کے طرزِ عمل میں کسی قدر فرق آگیا حالانکہ دوسروں کے مقابلے میں میں ان کا ہمدرد ہی تھا۔ میں ان کا ہمدرد اور دوست تو تھا لیکن اُن کا تعدادت کے پڑھنے کے بعد میں اُن کا رفیق اور ساتھی کبھی نہ بن سکا۔ کیونکہ ان کے حالات مجھ سے مختلف تھے اور انہوں نے اپنے تمغے حاصل کرنے کے لیے اور قسم کے کارنامے سرانجام دئے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ میں بھی انہی کی طرح ایک جنگی زخمی تھا لیکن زخمی ہونا تو ایک حادثہ ہے جو ہر کسی کو پیش آ سکتا ہے۔ میں اپنے آپ کو اپنے تمغوں کے لئے غیر مستحق بھی نہ سمجھتا تھا۔ اور نہ مجھے ان کے پہننے سے شرمندگی محسوس ہوتی تھی۔ بعض اوقات شراب کے سرور میں مجھے اس بات کا بھی احساس ہوتا تھا کہ میں نے وہ سب کارنامے کئے ہیں جن کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو تمغوں کا مستحق سمجھتے ہیں۔ لیکن رات کے وقت سنسان گلیوں میں سے گھر جاتے ہوئے، جب خون کو جسم میں جما دینے والی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہوتی تھی، جب بازار کی تمام دوکانیں بند ہوتیں اور میں سڑک کی بتیوں کے ساتھ ساتھ چل رہا ہوتا تو مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے واقعی جنگ میں میں نے کچھ نہ کیا ہوگا۔ اُس وقت مجھے موت سے بڑا خوف آتا اور اکثر بستر میں تنہا پڑا جاگتا رہتا۔ موت کا خوف مجھ پر اتنا طاری ہو جاتا کہ میں حیران ہوتا کہ اگر جنگ میں واپس گیا تو کیا کروں گا۔

وہ تینوں تمغہ یافتہ مجھے شکاری بازوں کی طرح نظر آتے۔ میں اپنے آپ کو باز نہ سمجھتا تھا۔ یہ ممکن ہے کہ جنہوں نے کبھی شکار نہیں کیا وہ مجھے بھی باز ہی سمجھتے ہوں۔ وہ تینوں اپنے آپ کو بڑا ماہر سمجھتے تھے اس لئے ہمارے درمیان ایک خلیج حائل ہونا شروع ہوگئی۔ لیکن جو لڑکا جنگ میں جاتے ہی زخمی ہو گیا تھا اس کے ساتھ میری دوستی قائم رہی کیونکہ اُسے

اب یہ معلوم نہ ہو سکتا تھا کہ اگر وہ جنگ میں زخمی نہ ہوتا تو کتنا عروج پاتا۔ اور نہ کوئی دوسرا ان امکانات کی روشنی میں اسے دیکھ سکتا تھا۔ نیز وہ اس لئے بھی پسند تھا کہ وہ بھی میری طرح شکاری باز بننے کے قابل ہی نہ تھا۔

وہ میجر جو تلوار کا بڑا دھنی تھا، دلیری کا قائل ہی نہ تھا اور مشین پر بیٹھے ہوئے وہ اپنا زیادہ وقت میری گرامر درست کرنے میں صرف کیا کرتا تھا۔ وہ اطالوی زبان میں میری گفتگو کی تعریف کیا کرتا تھا اور ہم دونوں بڑے مزے میں باتیں کرتے رہتے۔ ایک روز میں نے کہا کہ اطالوی زبان اتنی آسان ہے کہ میں اس میں زیادہ دلچسپی ہی نہیں لے سکتا۔ ہر بات بڑی آسانی سے ادا ہو جاتی ہے۔ "ٹھیک کہتے ہو" میجر نے کہا "لیکن تم گرامر کے استعمال کا طریقہ کیوں نہیں سیکھتے؟" اس وقت سے اطالوی زبان مجھے اتنی مشکل نظر آنے لگی کہ جب تک میں گرامر کے لحاظ سے اپنے فقرے کے صحیح ہونے کے متعلق مطمئن نہ ہو جاتا اسے زبان سے نہ نکالتا۔

میجر بڑی باقاعدگی سے ہسپتال آیا کرتا تھا۔ مجھے کوئی دن ایسا یاد نہیں آتا جب اس نے ناغہ کیا ہو حالانکہ اسے اس مشینی علاج میں قطعاً یقین نہ تھا۔ ہم میں سے کسی کو بھی اس علاج پر یقین نہ تھا اور ایک روز تو میجر نے برملا کہہ دیا کہ یہ سب بکواس ہے۔ یہ مشینیں بالکل نئی ہیں اور ہم پر ان کا تجربہ کیا جا رہا ہے۔ یہ ایک بے احمقانہ خیال اور دوسرے نظریوں کی طرح یہ بھی ایک نظریہ ہے!! اس روز وہ مجھ پر بھی برس پڑا اور کہنے لگا کہ تم بڑے غبی ہو اور میں احمق تھا کہ تمہیں گرامر پڑھانے کے لئے وقت ضائع کرتا رہا۔ اس کا قد چھوٹا تھا اور وہ مشین میں اپنا دایاں ہاتھ دیئے سیدھا بیٹھا تھا۔ چمڑے کی پٹیاں اوپر اور نیچے سے اس کی انگلیوں کو

حرکت دے رہی تھیں۔

"اگر کبھی جنگ بند ہو گئی تو تم اس کے بعد کیا کام کرو گے؟ گرامر کے مطابق صحیح فقرے میں جواب دو۔"

"میں امریکہ چلا جاؤں گا۔" میں نے جواب دیا

"کیا تمہاری شادی ہو چکی ہے؟"

"ہوئی تو نہیں لیکن امید ہے ہو جائے گی۔"

"تو پھر تم اور بھی زیادہ بیوقوف ہو" اس نے کہا۔ معلوم ہوتا تھا وہ بڑا غصے میں ہے۔ "شادی کبھی نہ کرنی چاہیئے۔"

"کیوں میجر صاحب؟"

"مجھے میجر صاحب نہ کہو۔"

"شادی کیوں نہ کی جائے؟"

"وہ شادی کر ہی نہیں سکتا ۔۔۔ مرد شادی کر ہی نہیں سکتا۔" اس نے غصے سے کہا۔ "اگر اُسے سب کچھ کھونا ہی ہے تو ایسے حالات پیدا ہی کیوں کرے۔ ایسے حالات پیدا ہی نہ کرنے چاہئیں۔ اسے ایسی چیزیں تلاش کرنی چاہئیں جن کے نقصان کا اندیشہ ہی نہ ہو۔"

وہ بڑے غصے اور تلخی سے بول رہا تھا اور باتیں کرتے ہوئے اس کی نظریں سامنے کی طرف جمی ہوئی تھیں۔

"لیکن یہ ضروری تو نہیں ہے کہ انسان خسارے ہی میں رہے۔"

"ہاں ضروری ہے۔" میجر نے پھر کہا۔ وہ دیوار کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے مشین کی طرف نظر کی اور ایک جھٹکے کے ساتھ اپنا چھوٹا ہاتھ اس میں سے نکال کر زور سے اپنی ران پر مارا۔ اور گرج کر بولا "وہ گھاٹے میں رہے گا۔

میرے ساتھ بحث نہ کرو" پھر اس نے ہسپتال کے ملازم کو بلایا اور بولا "اس لعنتی مشین کو بند کر دو۔"

وہ اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا جہاں مالش وغیرہ کی جاتی تھی۔ پھر میں نے اس کی آواز سنی کہ وہ ڈاکٹر سے اس کا ٹیلیفون استعمال کرنے کی اجازت لے رہا ہے۔ اس نے دروازہ بند کر لیا۔ جب وہ واپس آیا تو میں دوسری مشین پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اپنی قبا اور ٹوپی پہنی ہوئی تھی۔ وہ سیدھا میری طرف آیا اور آتے ہی اپنا بازو میرے کندھے پر رکھ دیا۔

"مجھے بے حد افسوس ہے" اُس نے اپنے تندرست ہاتھ سے میرے کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔ "مجھے یوں تلخ کلامی سے پیش نہ آنا چاہئے تھا۔ ابھی مجھے اپنی بیوی کی موت کی خبر ملی ہے۔ خدارا مجھے معاف کر دو۔"

"اوہ —" میں نے صدمے سے بے تاب ہو کر کہا۔ "مجھے بے حد افسوس ہے۔"

وہ سامنے کھڑا اپنے نچلے ہونٹ کو کاٹ رہا تھا۔ "اُف کتنی مصیبت ناک ہے اس کی موت۔" اس نے کہا۔ "مجھ میں تو صبر کی تاب ہی نہیں رہی۔"

اس کی نگاہیں مجھ سے گذر کر سامنے کھڑکی سے پار جا رہی تھیں۔ پھر وہ رونے لگ گیا۔ "مجھ میں صبر کا یارا ہی نہیں رہا۔" اور اس کی آواز گلے میں پھنس گئی۔ اور پھر سر کو اونچا اٹھائے روتے ہوئے اور بہادر سپاہیوں کی طرح سیدھا چلتے ہوئے، ہونٹوں کو کاٹتے ہوئے رخساروں پر بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ وہ دروازے سے باہر نکل گیا۔

ڈاکٹر نے مجھے بتایا کہ اس کی نوعمر بیوی جس کے ساتھ اس نے اُس وقت تک شادی نہ کی تھی جب تک اسے فوج سے اپاہج ہو جانے کی وجہ سے قطعی طور پر برخاست نہ کر دیا گیا تھا، نمونیہ کے مرض سے مر گئی ہے۔ وہ صرف چند ہی دن بیمار رہی۔ کسی کو اُس کے مرنے کی اُمید نہ تھی۔ میجر تین دن تک ہسپتال نہ آیا۔ پھر اس نے اپنی وردی پر سیاہ فیتہ لگا کے مقررہ وقت پر آنا شروع کر دیا۔ جب وہ دوبارہ آیا تو کمرے کی ساری دیوار پر ایسی تصویریں آویزاں تھیں۔ جن میں زخمی حالت اور مشینوں سے علاج کے بعد کی حالت دکھائی گئی تھی۔ میجر کی مشین کے سامنے تین تصویریں لگی تھیں جن میں میجر کے ہاتھ کی طرح کے تندرست شدہ ہاتھ دکھائے گئے تھے۔ معلوم نہیں یہ تصویریں ڈاکٹر نے کہاں سے حاصل کی تھیں حالانکہ ہم یہی سمجھتے تھے کہ ان مشینوں پر علاج کرانے والے ہم ہی پہلے مریض تھے۔ میجر کے لئے یہ تصویریں بے فائدہ تھیں کیونکہ اس کی نگاہیں ہمیشہ کھڑکی کے باہر ٹکٹکی لگائے رہتیں۔

کسی چیز کا انجام

ہم مانز میں ایک باغ کے اندر گھات میں بیٹھے تھے۔ بکلے اپنی گارد لئے گشت کرتا ہوا دریا پار سے آیا۔ پہلا جرمن سپاہی جو میں نے دیکھا، باغ کی دیوار پر چڑھا۔ ہم اس وقت تک خاموش بیٹھے رہے جب تک اس نے اپنی ٹانگیں دیوار کے آر پار کرلیں۔ وہ اسلحہ سے لدا ہوا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔ جب ہم نے گولی ماری تو باغ کے اندر گر پڑا۔ پھر ذرا پرے تین اور سپاہی دیوار پر چڑھے۔ انہیں بھی ہم نے مار گرایا۔ باقی بھی اسی طرح آتے رہے، اور مرتے رہے۔

پُرانے وقتوں میں ہارٹنز عمارتی لکڑی کی منڈی تھی۔ یہاں کے باشندے ہر وقت کارخانے کے بڑے بڑے آرے چلنے کی آواز سنتے رہتے تھے۔ پھر ایک سال ایسا آیا کہ تختے چیرنے کے لئے شہتیر ختم ہو گئے۔ تختے

لانے والے جہاز خلیج میں آتے اور لکڑی کی کاٹ چھانٹ جو بڑے بڑے ڈھیروں میں پڑی ہوئی تھی لاد کر چلے جاتے۔ ساری لکڑی ختم ہو گئی۔ آخر کارخانے کی مشینیں اُکھیڑی گئیں اور کارخانے کے مزدوروں نے اسے ایک جہاز میں لاد دیا۔ جہاز ساحل پر سے جھیل کے کھلے پانی کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس میں دو بڑے بڑے آرے اور وہ ریڑھی بھی لدی ہوئی تھی جو بھاری بھرکم شہتیروں کو تیزی سے گھومتے ہوئے آروں سے جا ملاتی تھی، اسی میں سارے بیلنے، پہئیے، پٹے اور لوہے کا دوسرا سامان تختوں پر ڈھیر ہو رہا تھا۔ جہاز پر بادبان تان دئے گئے، اُن میں ہوا بھری اور جہاز جھیل کے کھلے پانیوں پر وہ سب کچھ لے کر روانہ ہو گیا جس سے کارخانہ بنا تھا اور جس سے خلیج ہارٹنتر ایک قصبہ بن گیا تھا۔

ایک منزلے لکڑی کے مکان، ہوٹل، کمپنی کے گودام، کارخانے کے دفاتر اور خود کارخانے کی عظیم الشان عمارت ویران ہو کر اس زمین پر کھڑی رہ گئی جہاں دلدل میں اُگی ہوئی گھاس پر ہر طرف لکڑی کا برادہ پھیلا ہوا تھا۔

دس سال بعد جب نک اور مارجوری کشتی کھیتے ہوئے اس ساحل پر آئے تو سوائے بنیاد کے پتھروں کے اس کارخانے کا کوئی نشان باقی نہ تھا۔ وہ اُس ساحل کی طرف آ رہے تھے جہاں ریتیلا کنارہ یکایک بارہ فٹ گہرے سیاہی مائل پانی سے آملتا ہے۔ وہ اُس جگہ کی طرف آ رہے تھے جہاں ٹراؤٹ پکڑنے کے لئے شکاری اپنے کانٹے ڈالا کرتے تھے۔

"نک یہ رہا ہمارا پرانا ویرانہ" مارجوری نے کہا

نک نے کشتی کھیتے ہوئے ہرے بھرے درختوں میں سفید پتھروں

کی طرف دیکھا۔ اور بولا "ہاں یہی ہے۔"

"تمہیں وہ زمانہ یاد ہے جب یہاں کارخانہ ہوا کرتا تھا؟" مارجوری نے پوچھا۔

"ہاں یاد ہے۔" نک نے جواب دیا۔

"ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے کسی پرانے قلعے کے آثار ہوں۔" نک نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ ساحل کے ساتھ ساتھ کارخانے کی جگہ سے آگے نکل گئے۔ پھر نک نے خلیج کو عبور کرنا شروع کر دیا۔

"یہ تو طعمے کو چھوتی نہیں۔"

"بالکل نہیں۔" مارجوری نے کہا۔ اس کی ساری توجہ اپنی بنسی پر مرکوز تھی۔ کشتی آہستہ آہستہ بہتی جا رہی تھی۔ اسے مچھلی کے شکار کا بڑا شوق تھا۔ نک کے ساتھ شکار کھیلنے میں بڑا لطف آتا تھا۔

کشتی کے پاس ہی ایک بڑی ٹراؤٹ پانی سے اچھلی۔ نک نے ایک چپو پر سارا زور لگا کر کشتی کو اس طرف موڑا تاکہ طعمہ اس جگہ پہنچ سکے جہاں ٹراؤٹ چر رہی تھی۔ جونہی اس کی پیٹھ پانی کی سطح پر نمودار ہوئی ننھی ننھی مچھلیاں گھبرا کر چاروں طرف یوں اچھلیں جیسے کسی نے مٹھی بھر کنکریاں پھینک دی ہوں۔ کشتی کی دوسری سمت ایک اور ٹراؤٹ اچھلی۔

"اب انہوں نے چرنا شروع کیا ہے۔" مارجوری نے کہا۔

"لیکن یہ طعمے پر منہ نہیں ڈالتیں۔" نک بولا

انہوں نے کشتی کو اس طرح نکالا کہ دونوں اچھلنے والی مچھلیوں کے درمیان سے ان کا کانٹا گزرے اور پھر ساحل کی طرف چل پڑے۔ مارجوری نے اپنی ڈوری اس وقت تک نہ لپیٹی جب تک کشتی کنارے نہ آن لگی۔

انہوں نے کشتی کو کنارے پر گھسیٹ لیا اور نک نے چھوٹی چھوٹی زندہ مچھلیوں کی بالٹی اٹھالی۔ مچھلیاں بالٹی کے پانی میں تیر رہی تھیں۔ نک نے بالٹی میں ہاتھ ڈال کر تین پکڑلیں اور سر کاٹ کر انہیں چھیل دیا۔ مارجوری نے بڑی کوشش سے ایک پکڑی اور سر کاٹ کر اسے چھیلا۔ نک نے اس کی مچھلی کی طرف دیکھا۔

"اس کے گلپھڑے نہ نکالنا" اس نے کہا۔ "طعمے کے لئے گلپھڑوں سمیت زیادہ بہتر ہوتی ہے۔"

اس نے ساری مچھلیوں کو دم کی طرف سے پرو لیا۔ ہر بنسی پر دو دو کانٹے لگے ہوئے تھے۔ پھر مارجوری ڈور کو منہ میں پکڑے اور کشتی کھیتے ہوئے ساحل سے پرے لے گئی۔ وہ نک کو کنارے پر کھڑے اور ریل سے ڈور کو کھولتے ہوئے دیکھتی رہی۔

"میرا خیال ہے یہاں رک جاؤ" نک نے آواز دی

"یہاں کانٹے ڈال دوں؟" مارجوری نے ڈوری کو ہاتھ میں تھامے ہوئے پکار کر پوچھا۔

"ہاں ڈال دو" مارجوری نے ڈوری چھوڑ دی اور کانٹوں کو پانی میں ڈوبتے ہوئے دیکھتی رہی۔

وہ کشتی کو واپس لے آئی اور پھر دوسری لے کر چلی گئی۔ ہر مرتبہ نک بنسی کے دستے کو کسی لکڑی کے سہارے کھڑا کر دیتا تاکہ بنسی مضبوطی سے ایک زاویے پر جمی رہے۔ اس نے ڈھیلی ڈوری کو ریل پر لپیٹ لیا تاکہ ریت میں پڑے ہوئے طعمے سے لے کر بنسی تک ڈوری تنی رہے اور پھر ریل پر کمانی چڑھا دی جب کوئی جھیل کی تہہ میں چرتی ہوئی ٹراؤٹ طعمے کو منہ میں دبا کر بھاگتی ہے تو ڈوری تیزی کے ساتھ ریل سے کھلتی ہے اور ریل کی کمانی شور مچا دیتی ہے۔

مارجوری ڈوری سے بچتی ہوئی کنارے کے قریب آئی اور پھر اتنے

زور سے چپّو مارا کہ کشتی ریتیلے کنارے پر کچھ دُور تک چڑھ آئی۔ اس کے ساتھ ہلکی ہلکی لہریں بھی چلی آئیں۔ مارجوری کشتی سے اتری تو نِک نے کشتی کو اور اُوپر گھسیٹ لیا۔

"کیا بات ہے نِک؟" مارجوری نے پوچھا۔

"معلوم نہیں۔" نِک نے آگ کے لئے لکڑیاں جمع کرتے ہوئے کہا۔

انہوں نے بہہ کر آئی ہوئی لکڑیوں سے آگ جلائی۔ مارجوری کشتی میں سے ایک کمبل اُٹھا لائی۔ شام کی ہلکی ہلکی ہوا دھوئیں کو اُن کی نشست کی طرف لانے لگی۔ چنانچہ مارجوری نے اپنا کمبل جھیل اور آگ کے درمیان بچھا دیا۔

مارجوری آگ کی طرف پشت کئے نِک کے انتظار میں بیٹھ گئی۔ وہ بھی آکر کمبل پر اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ابھی پوری طرح اندھیرا نہ ہوا تھا۔ آگ کی روشنی پانی تک پہنچ رہی تھی۔ اُن دونوں کو تاریک پانی کے کنارے زاویہ بناتی ہوئی دونوں بنسیاں نظر آ رہی تھیں۔ ریلیں آگ کی روشنی میں چمک رہی تھیں۔

مارجوری نے کھانے کی ٹوکری کھولی۔

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" نِک نے کہا۔

"آؤ نِک، کھا بھی لو۔"

"اچھا لاؤ۔"

وہ خاموشی سے کھانا کھاتے رہے اور دونوں بنسیوں اور پانی میں آگ کے چمکتے ہوئے سائے کی طرف دیکھتے رہے۔

"آج رات چاند بھی نکلے گا۔" نِک نے جھیل کے پار پہاڑیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جن کی چوٹیاں روشن ہو رہی تھیں۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ پہاڑیوں کے پچھلی طرف چاند اُبھر رہا ہے۔

"مجھے معلوم ہے۔" مارجوری نے خوشی سے کہا۔

"تمہیں تو ہر بات پہلے ہی سے معلوم ہوتی ہے۔" نِک نے کہا۔

"نِک خدا کے لئے اِس طرح تو نہ بولو۔ دیکھو، ایسی خشک باتیں نہ کرو۔"

"اس میں میرا کیا قصور ہے۔ تم باتیں ہی ایسی کرتی ہو۔ تمہیں ہر بات کا علم ہوتا ہے۔ یہی تو مصیبت ہے۔ تم سمجھتی ہو تمہیں ہر بات کا علم ہے۔"

مارجوری خاموش رہی

"میں نے ہی تو تمہیں ہر بات سکھائی ہے۔ اور پھر تم کہتی ہو کہ تمہیں سب کچھ معلوم ہے۔ کوئی ایسی بات بھی ہے جو تم نہیں جانتیں؟"

"چپ رہو۔" مارجوری بولی۔ "وہ دیکھو چاند نکل آیا ہے۔"

وہ ایک دوسرے کو چھوئے بغیر کمبل پر چپ چاپ بیٹھے رہے اور چاند کو طلوع ہوتے ہوئے دیکھتے رہے۔

"تم ایسی باتیں کرنا کیوں شروع کر دیتے ہو۔ اصل بات کیا ہے؟"

"معلوم نہیں۔"

"تمہیں معلوم تو ضرور ہے۔"

"نہیں بالکل معلوم نہیں۔"

"کہہ دو۔ کہتے کیوں نہیں؟"

نِک چاند کو پہاڑیوں پر بلند ہوتے ہوئے دیکھتا رہا۔

"اب کچھ لطف نہیں رہا۔"

وہ مارجوری کی طرف دیکھتے ہوئے جھجکتا تھا۔ آخر اُس نے اُس کی طرف دیکھا۔ وہ اُس کی طرف پیٹھ کئے بیٹھی تھی۔ وہ اُس کی پیٹھ کی طرف دیکھتا رہا۔ "اب کچھ لطف نہیں رہا۔ کچھ بھی نہیں رہا۔"

مارجوری نے کوئی جواب نہ دیا تو وہ کہتا چلا گیا "مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میری اندرونِ جسم کی ہر چیز جہنم واصل ہو چکی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا، مارج، میں اسے بیان بھی نہیں کر سکتا۔"

وہ اس کی پیٹھ کی طرف دیکھتا چلا گیا۔

"محبت میں لطف نہیں آتا؟" مارجوری نے پوچھا

"نہیں۔" نِک نے جواب دیا۔ مارجوری اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ نِک اپنے سر کو ہاتھوں میں سنبھالے وہیں بیٹھا رہا۔

"میں کشتی لے جا رہی ہوں" مارجوری نے چلتے ہوئے کہا، "تم خشکی کے راستے چلے آنا۔"

"بہت اچھا،" نِک نے کہا۔ "ٹھہرو میں کشتی پانی میں دھکیل دوں۔"

"اس کی کوئی ضرورت نہیں۔" وہ چاندنی رات میں کشتی کو لے کر نکل گئی۔ نِک آگ کے پاس آکر کمبل میں منہ لپیٹ کر لیٹ گیا۔ اسے مارجوری کے چپوؤں کی آواز آ رہی تھی۔

وہ دیر تک وہیں لیٹا رہا۔ جب بِل جنگل میں سے نکل کر کھلی جگہ میں چلا آ رہا تھا اور اس کے قدموں کی آواز نزدیک پہنچ گئی تھی، وہ پھر بھی لیٹا رہا۔ بِل آگ کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ بِل نے بھی اسے نہ بلایا۔

"معاملہ ٹھیک سے طے ہو گیا؟" بِل نے پوچھا

"ہاں۔" نِک نے اسی طرح اوندھے منہ لیٹے ہوئے جواب دیا

"کوئی جھگڑا تو نہیں ہوا؟"

"نہیں کوئی جھگڑا نہ ہوا۔"

"تمہارا کیا حال ہے؟"

"تم جاؤ بل ۔ تھوڑی دیر کے لئے مجھے اکیلا چھوڑ دو۔"
بل نے کھانے کی ٹوکری میں سے ایک سنبوسہ منتخب کیا اور شکار پر
لگی ہوئی بنسیوں کو دیکھنے چلا گیا۔

ہندی کیمپ

جھیل کے کنارے ایک اور کشتی بھی کھڑی تھی۔ دو سُرخ ہندی کھڑے انتظار کر رہے تھے۔

نِک اور اس کا باپ کشتی کے پچھلے حصّے میں بیٹھ گئے۔ سرخ ہندیوں نے کشتی کو دھکیلا اور ان میں سے ایک کھینے کے لئے اس میں سوار ہو گیا۔ چچا جارج کیمپ کی کشتی میں سوار ہو گئے۔ نوجوان سرخ ہندی نے اسے بھی دھکا دیا اور پھر اسے کھینے لگا۔

یہ دونوں کشتیاں رات کی تاریکی میں روانہ ہوئیں۔ نِک کو دوسری کشتی کے چپوؤں کی آواز دُھند میں کہیں آگے سنائی دے رہی تھی۔ ہندی چپوؤں کو جلد جلد چلا رہے تھے۔ نِک اپنے باپ کے بازو پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ جھیل کے پانی پر کافی سردی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ ہندی بڑے زور سے چپّو چلا رہا تھا لیکن دوسری کشتی اُن سے آگے ہی رہی۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں، ابّا؟" نِک نے پوچھا

"ہندی کیمپ میں۔ وہاں ایک عورت سخت بیمار ہے۔"

"اوہ!" نِک نے کہا

جھیل کے دوسرے کنارے پر پہنچے تو چچا جارج کی کشتی پہنچ چکی تھی اور وہ اندھیرے میں کھڑا سگار پی رہا تھا۔ نوجوان ہندی نے کشتی کنارے پر کھینچ لی۔ چچا جارج نے اُن دونوں کو ایک ایک سگار دیا۔

کنارے سے چل کر وہ ایک سبزہ زار سے گذرے جہاں گھاس اوس سے تر ہو رہی تھی۔ ہندی ایک لالٹین لئے آگے آگے چل رہے تھے۔ پھر وہ ایک جنگل میں داخل ہوئے اور ایک پگڈنڈی پر چلتے رہے جو پہاڑیوں کی طرف جاتی تھی۔ اس پگڈنڈی پر چلنا بڑا آسان تھا کیونکہ دونوں طرف سے درخت کاٹے جا چکے تھے۔ نوجوان ہندی نے رُک کر لالٹین بجھا دی اور وہ سب کے سب پھر سڑک پر چل پڑے۔

وہ ایک موڑ پر پہنچے تھے کہ ایک کتّا بھونکتا ہوا ان کی طرف بڑھا۔ سامنے اُن جھونپڑوں کے دیئے جل رہے تھے جن میں چھال اُتارنے والے ہندی مزدور رہتے تھے۔ اب ان میں سے اور بھی کتے نکل آئے۔ دونوں ہندیوں نے انہیں واپس بھگا دیا۔ سڑک کے نزدیک والے جھونپڑے کی کھڑکی میں ایک دیا روشن تھا۔ اور اس کے دروازے میں ایک عورت لیمپ لئے کھڑی تھی۔

مکان کے اندر دیوار میں لگے ہوئے ایک تخت پر ایک جوان عورت پڑی تھی جو پچھلے دو روز سے دردِ زہ میں مبتلا تھی۔ کیمپ کی تمام عورتیں اس کی خدمت کر رہی تھیں۔ مرد کچھ دور جہاں عورت کی چیخ پکار کی آواز نہ پہنچ سکتی تھی، سڑک پر اندھیرے میں بیٹھے تمباکو پی رہے تھے جب نِک، اس کا باپ، دونوں ہندی اور چچا جارج داخل ہوئے تو عورت

نے پھر ایک دردناک چیخ ماری۔ وہ نچلے تختے پر لیٹی تھی اور اس کا جسم رضائی میں بھی بہت بڑا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا سر ایک طرف کو مڑا ہوا تھا۔ اوپر کے تختے پر اس کا خاوند لیٹا ہوا تھا۔ تین روز ہوئے اس کا پاؤں کلہاڑی سے بہت بری طرح زخمی ہو گیا تھا۔ وہ ایک پائپ پی رہا تھا۔ کمرے میں بڑی بدبو پھیلی ہوئی تھی۔

نِک کے باپ نے چولھے پر کچھ پانی گرم رکھنے کو کہا اور اس کے گرم ہونے کے دوران میں نِک سے باتیں کرنے لگا۔

"نِک، اس عورت کے ہاں ایک بچہ پیدا ہونے والا ہے"

"میں جانتا ہوں" نِک نے کہا

"نہیں، ساری بات تمہیں معلوم نہیں" اس کے باپ نے سمجھایا "میری بات سنو۔ یہ تکلیف جو اس عورت کو ہو رہی ہے اسے دردِ زہ کہتے ہیں۔ بچہ پیدا ہونا چاہتا ہے اور یہ عورت بھی کوشش کر رہی ہے کہ کسی طرح وہ پیدا ہو جائے۔ اس عورت کے تمام پٹھے اس کوشش میں ہیں۔ چنانچہ جب یہ عورت چیختی ہے تو اسی وجہ سے چیختی ہے"

"سمجھ گیا" نِک نے کہا۔

عین اس وقت عورت پھر چیخ اٹھی۔

"ابا، کیا اسے کوئی ایسی چیز نہیں دی جا سکتی جس سے یہ چیخنا بند کر دے؟"

"نہیں، میرے پاس اسے بے ہوش کرنے کے لئے کوئی چیز نہیں ہے" اس کے باپ نے بتایا

"اس کی چیخوں پر کوئی دھیان نہ دینا چاہیئے، میں تو نہیں سنتا بھی

نہیں کیونکہ ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔"

اُوپر کے تختے پر خاوند نے کروٹ لی اور دیوار کے ساتھ جا لگا۔

باورچی خانے سے عورت نے اشارے سے بتایا کہ پانی گرم ہو چکا ہے نِک کا باپ باورچی خانے میں گیا اور بڑے دیگچے میں سے آدھا پانی ایک کھلے برتن میں ڈال لیا۔ اُس نے دیگچے والے پانی میں بہت سی چیزیں اپنے رومال سے کھول کر ڈال دیں۔

"اس پانی کو پھر اُبالو۔" اس نے عورت سے کہا اور پھر صابن کی ٹکیہ نکال کر اپنے ہاتھ دھونے میں مصروف ہو گیا۔ نِک اپنے باپ کو ہاتھوں میں صابن کی جھاگ ملتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس کا باپ بڑے دھیان سے اور بڑی کوشش سے اپنے ہاتھ صاف کرتا جا رہا تھا اور ساتھ ساتھ باتیں بھی کرتا جاتا تھا۔

"دیکھو نِک قاعدے کے مطابق بچے جب پیدا ہوتے ہیں تو پہلے ان کا سر ظاہر ہوتا ہے، لیکن بعض اوقات اس کے خلاف بھی ہو جاتا ہے جب ایسی بے قاعدگی ہو تو پھر وہ ہر ایک کے لئے تکلیف کا باعث بن جاتے ہیں ممکن ہے مجھے اس عورت کا اپریشن کرنا پڑے۔ ذرا اچھی طرح دیکھ لیں، پھر اس کے متعلق فیصلہ کریں گے۔"

جب وہ اپنے ہاتھوں کی صفائی کے متعلق مطمئن ہو گیا تو کمرے میں داخل ہُوا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

"جارج، تم اس رضائی کو اوپر کی طرف کھینچ لو۔ میں اسے ہاتھ لگانا نہیں چاہتا۔"

جب وہ اپریشن کرنے لگا تو چچا جارج اور تین بسندیوں نے

عورت کو پکڑے رکھا۔ اُس نے چچا جارج کے بازو پر کاٹ کھایا اور اُس نے غصّے میں کہا "کمبخت ہندی کُتیا" جو ہندی چچا جارج کی کشتی کھے کر لایا تھا۔ ہنس پڑا۔ نِک اپنے باپ کے لئے پانی کی پیلچی تھامے ہوئے تھا۔ اس اپریشن میں بڑی دیر لگی۔

نِک کے باپ نے نوزائیدہ بچے کے منہ پر چپت لگائی تاکہ اس کی سانس جاری ہو جائے اور پھر بوڑھی عورت کو پکڑا دیا۔

"دیکھو نِک یہ لڑکا ہے" باپ نے کہا "ڈاکٹری پڑھو گے نِک؟"

"کیوں نہیں ابا" نِک نے کہا۔ اُس نے اپنی نظریں دوسری طرف پھیر رکھی تھیں۔ اور جو کچھ اس کا باپ کر رہا تھا اُدھر نہ دیکھ رہا تھا۔

"بس اب ٹھیک ہے" اُس کے باپ نے کوئی چیز پیلچی میں ڈالتے ہوئے کہا۔

نِک نے اس طرف نہ دیکھا۔

"اب میں کچھ ٹانکے لگانے لگا ہوں" اس کے باپ نے کہا "اب تمہاری مرضی ہے اس طرف دیکھو یا نہ دیکھو۔ میں نے جو جگہ نشتر سے چیری تھی اسے سینے لگا ہوں"

نِک نے اُس طرف نہ دیکھا۔ اس کی دیکھنے کی خواہش کافی عرصے کے لئے دُور ہو گئی تھی۔

یہ کام ختم کر کے اس کا باپ اُٹھ کھڑا ہوا۔ چچا جارج اور تینوں ہندی بھی اُٹھ بیٹھے۔ نِک نے پیلچی باورچی خانے میں رکھ دی۔

چچا جارج نے اپنے زخمی بازو کی طرف دیکھا۔ نوجوان ہندی عورت کے کاٹ کھانے کو یاد کر کے پھر مسکرا دیا۔

میں اس پر آکسائیڈ رگڑے دیتا ہوں۔" ڈاکٹر نے کہا۔

اس نے ہندی عورت کو جھک کر دیکھا۔ اسے اب سکون آگیا تھا اور اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ بچے کا کیا ہوا ہے۔

"میں صبح پھر آؤں گا۔" ڈاکٹر نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "دوپہر تک سینٹ اگنیس سے نرس بھی پہنچ جائے گی اور جن جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ ہمراہ لیتی آئے گی۔"

وہ اپنے کام سے بڑا مطمئن تھا اور باتیں کرنے پر اس کا جی اس طرح مائل تھا جیسے فٹ بال کے کھلاڑی کھیل ختم ہونے کے بعد کپڑے بدلتے ہوئے باتیں کرتے ہیں۔

"جارج، یہ واقعہ طبی رسالے میں لکھنے کے قابل ہے۔" ڈاکٹر نے کہا "یہ اپریشن جیبی چھری سے کیا گیا ہے اور نو فٹ لمبے گاؤدم ریشے سے زخم سیا گیا ہے۔"

چچا جارج دیوار کے سہارے کھڑا اپنے زخمی بازو کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"تم بڑے قابل ڈاکٹر ہو۔ یہ تو مانی ہوئی بات ہے۔" چچا جارج نے کہا۔

"بچے کا باپ بڑا مسرور ہوگا ذرا اس سے بھی ملتے چلیں۔ بیوی کے ایسے حالات میں خاوند کو بھی بڑا دکھ ہوتا ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ خاوند نے بڑے صبر و سکون سے سب کچھ برداشت کیا ہے۔"

اس نے ہندی کے سر سے کمبل ہٹایا تو اس کا ہاتھ گیلا ہو گیا۔ لیمپ پکڑ کر وہ نچلے تختے کے کنارے پر کھڑا ہو گیا اور جھانک کر دیکھا۔ ہندی کا منہ دیوار کی طرف تھا۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک اس کی گردن کٹی پڑی تھی۔ اور

جہاں اس کے بدن کے نیچے جھکی ہوئی جگہ تھی سارا خون جمع ہو رہا تھا۔ اس کا سر بائیں بازو کے سہارے پڑا تھا۔ اور کھلا اُسترا جس کے پھل کی دھار اُوپر کی طرف تھی، کمبلوں کے نیچے پڑا تھا۔

"جارج! نِک کو جھونپڑی سے باہر لے جاؤ۔" ڈاکٹر نے آواز دی اب اس کی ضرورت نہ تھی کیونکہ نِک نے باورچی خانے کے دروازے میں کھڑے اپنے باپ کو لیمپ کی روشنی میں ہندی کا سر گردن کے ساتھ ملاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

صبح کی روشنی نمودار ہو رہی تھی جب وہ پگڈنڈی پر سے چلتے ہوئے جھیل کے کنارے کی طرف آ رہے تھے۔

"مجھے اس بات کا بڑا افسوس ہے نکی کہ میں تمہیں اپنے ساتھ لے آیا۔" کامیاب آپریشن کی ساری خوشی اس کے دل سے محو ہو چکی تھی۔ "میں نے خواہ مخواہ تمہیں اس جھگڑے میں گھسیٹا۔"

"ابا! کیا عورتوں کو بچہ جنتے ہوئے ہمیشہ اتنی ہی تکلیف ہوتی ہے؟" نِک نے پوچھا۔

"نہیں ایسا بہت ہی کم ہوتا ہے۔"

"اس شخص نے اپنے آپ کو مار کیوں دیا؟"

"کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ شاید وہ بیوی کی تکلیف برداشت نہیں کر سکا۔"

"کیا اکثر مرد یونہی خودکشی کر لیتے ہیں؟"

"نہیں نِک، عام طور پر ایسا نہیں ہوتا۔"

"تو کیا اکثر عورتیں خودکشی کرتی ہیں؟"

"شاید ہی کوئی کرتی ہو۔"

"کیا وہ کبھی خودکشی نہیں کرتیں؟"

"بعض اوقات کربھی لیتی ہیں۔"

"ابّا!"

"ہاں بیٹے۔"

"چچا جارج کہاں چلے گئے؟"

"وہ بھی آجائیں گے۔"

"کیا مرنا بڑا دشوار ہوتا ہے؟"

"نہیں کوئی ایسا دشوار بھی نہیں ہوتا۔نِک، حالات پر منحصر ہے۔"

وہ کشتی میں سوار ہو گئے۔ نِک سواری کی جگہ پر بیٹھ گیا اور باپ چپّو چلانے لگا۔ پہاڑیوں پر سے سورج طلوع ہو رہا تھا۔ ایک مچھلی پانی میں اُچھلی اور پانی کی سطح پر ایک حلقہ سا پڑ گیا۔نِک اپنا ہاتھ پانی میں لٹکائے ہوئے تھا۔ صبح کی ٹھنڈی ہوا میں پانی گرم معلوم ہوتا تھا۔

صبح سویرے، کشتی میں بیٹھ کر جھیل کو قطع کرتے ہوئے، جبکہ اس کا باپ کشتی کھے رہا تھا نِک کو بڑا پختہ یقین ہو رہا تھا کہ وہ کبھی نہ مرے گا۔

بیچاری بلّی

وُہ گھوڑے کی ٹانگوں پر تڑاق تڑاق ڈنڈے برسا رہے تھے اور وُہ بار بار الف ہو جاتا تھا۔ سوار نے رکابیں اُوپر کھینچ لیں اور انہیں کاٹھی میں اُڑس لیا۔ جب گھوڑا پو یہ چلنے لگا تو اس کی پچھلی ٹانگوں کے درمیان لٹکتی ہوئی نیلی سی تھیلی آگے اور پیچھے جھُولنے لگی۔ اکھاڑے کے چھوکرے اس کی پچھلی ٹانگوں پر ڈنڈے مارنے لگے۔ وہ اکھاڑے میں پویہ چلتا چلتا یکایک اکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ ایک چھوکرے نے اس کی لگامیں پکڑ لیں اور گھسیٹتا ہوا آگے لے گیا۔ سوار نے دونوں طرف سے مہمیز اس کی پسلیوں میں گاڑ دئے اور آگے کو جھک کر بیل کے سامنے نیزہ ہلانے لگا۔ گھوڑے کی اگلی ٹانگوں کے درمیان سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کے پاؤں ڈر کے مارے ڈگمگا رہے تھے۔ بیل اُس پر حملہ کرنے کے لئے کسی طرح آمادہ نہ ہوتا تھا۔

ہوٹل میں صرف دو ہی امریکی ٹھہرے ہوئے تھے۔ جب وہ اپنے کمرے

سے اندر باہر آتے جاتے تو سیڑھیوں میں سے گذرنے والوں میں کسی کو اپنا شناسا نہ پاتے تھے۔ ان کا کمرہ دوسری منزل پر سمندر کے رُخ واقع تھا۔ اسی طرف باغِ عامہ بھی تھا جس میں ایک یادگار بنی ہوئی تھی۔ باغِ عامہ میں تاڑ کے درخت اُگے ہوئے تھے اور سبز رنگ کی بنچیں بچھی تھیں۔ صاف موسم میں ایک نہ ایک مصور اپنا سامان لئے ضرور یہاں بیٹھا نظر آجاتا۔ مصوروں کو ان تاڑ کے درختوں اور ہوٹلوں کا نظارہ بڑا بھاتا تھا۔ اطالوی دُور دُور سے اس یادگار کو دیکھنے کے لئے آتے تھے۔ یہ کانسی کا بنا ہوا مجسمہ تھا اور بارش میں بڑا چمک اُٹھتا تھا۔ اسوقت بارش ہو رہی تھی۔ تاڑ کے پتوں سے پانی کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ پتھریلی روشوں پر گڑھوں میں پانی اکٹھا ہو رہا تھا۔ سمندر سے لمبی لمبی لہریں بارش ہوتے ہوئے ساحل پر آ کر ٹکراتیں اور واپس جا کر پھر لمبی لکیر کی صورت میں بارش میں آجاتیں۔

جنگ کی اس یادگار کے قریب چوک میں جو موٹریں کھڑی تھیں اب غائب ہو چکی تھیں۔ چوک کے اُس پار کیفے کے دروازے میں ایک بیرا کھڑا اسنسان چوک کی طرف دیکھ رہا تھا۔

امریکی دلہن کھڑکی میں کھڑی باہر کا نظارہ کر رہی تھی۔ باہر عین ان کی کھڑکی کے سامنے سبز میز کے نیچے جس کے چاروں طرف پانی ٹپک رہا تھا، ایک بلی دبکی بیٹھی تھی۔

وہ اس طرح سمٹی سکڑی بیٹھی تھی کہ پانی کا کوئی قطرہ اسے بھگو نہ دے۔

"میں نیچے جا کر اس بلی کو لاتی ہوں۔" امریکی دلہن نے کہا۔

"میں لے آتا ہوں،" خاوند نے بستر میں سے کہا۔

"نہیں میں خود لاؤں گی۔ بیچاری بلی پانی سے بچنے کے لئے میز کے

نیچے دبکی بیٹھی ہے ۔"

خاوند پھر پڑھنے میں مصروف ہو گیا ۔ وہ چارپائی کی پائنتی کی طرف دو تکئے رکھے آرام سے لیٹا تھا ۔

" دیکھو بھیگ نہ جانا" اس نے آواز دی

بیوی سیڑھیاں اُتر گئی ۔ اور جب وہ ہوٹل کے دفتر کے پاس سے گذرنے لگی تو ہوٹل کا مالک اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور جھک کر آداب بجا لایا ۔ اس کی میز دفتر کے دوسرے سرے پر تھی ۔ بوڑھا آدمی تھا اور کافی لمبے قد کا ۔

" مزاج شریف ؟" عورت نے کہا ۔ اسے یہ ہوٹل والا بڑا پسند تھا ۔

" بڑی مہربانی ، خاتون ۔ آج کا موسم بڑا خراب ہے ۔"

وہ نیم روشن کمرے کے کونے میں اپنے ڈسک کے پیچھے کھڑا تھا ۔ اسے یہ ہوٹل والا بڑا پسند تھا ، خاص طور پر اس کی وہ ادا جب وہ بڑی سنجیدگی سے شکایات سنتا تھا ۔ اُسے بوڑھے کا پُروقار طرزِ عمل بڑا ہی بھاتا تھا خصوصاً جب وہ اس کی کوئی خدمت بجا لاتا تھا ۔ اسے اس کے احساسات کی بھی بڑی قدر تھی ۔ اس کا بوڑھا بھاری چہرہ اور بڑے بڑے ہاتھ بھی اسے بڑے پسند تھے ۔

اس نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا ۔ بارش اب اور تیز ہو گئی تھی ۔ ایک آدمی ربڑ کی برساتی اوڑھے چوک سے گذر کر کیفے میں داخل ہو رہا تھا ۔ بلّی کہیں داہنی طرف ہو گی ۔ شاید وہ عمارت کے چھجے کے نیچے چلتی ہوئی وہاں تک پہنچ جائے ۔ وہ دروازے میں کھڑی ہی تھی کہ ایک چھتری اس کے پیچھے کھلی ۔ یہ وہی خادمہ تھی جو ان کے کمرے پر مقرر تھی ۔

" بیگم ، بارش میں بھیگ نہ جائیے ۔" اس نے مسکراتے ہوئے اطالوی زبان

ہیں کہا۔ اسے یقیناً ہوٹل کے مالک نے ہی بھیجا ہوگا۔

خادمہ اس پر سایہ کیئے رہی اور وہ کنکریلی روش پر چلتی ہوئی اپنی کھڑکی کے نیچے جا پہنچی۔ میز وہیں موجود تھی۔ بارش سے دھلی ہوئی، چمکدار سبز، لیکن بلی کہیں غائب ہو چکی تھی۔ اسے بڑی مایوسی ہوئی۔ خادمہ نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"کیا معاملہ ہے بیگم؟"

"یہاں ایک بلی تھی۔" امریکی لڑکی نے جواب دیا۔

"بلی؟"

"ہاں ایک بلی۔"

"بلی؟ بارش میں بلی؟"

"ہاں" اس نے جواب دیا "میز کے نیچے بیٹھی تھی۔ میں بڑی خواہش سے اسے لینے آئی تھی۔ مجھے وہ بلی چاہیئے تھی۔"

جب وہ انگریزی میں بات کرتی تو خادمہ کا منہ کھنچ جاتا تھا۔

"آؤ بیگم" خادمہ نے کہا۔ "جلدی اندر چلو، تم بھیگ جاؤ گی۔"

"چلو" امریکی لڑکی نے کہا۔

وہ کنکریلا راستہ طے کرتی ہوئی دروازے میں سے گذر گئیں۔ خادمہ چھتری بند کرنے کے لئے پیچھے رک گئی۔ جب وہ دفتر کے سامنے سے گذری تو ہوٹل کا مالک اپنے ڈیسک پر سے پھر جھکا۔ لڑکی نے کوئی چھوٹی سی اور سخت چیز اپنے اندر محسوس کی۔ ہوٹل والے کے طرزِ عمل سے اسے محسوس ہوا کہ اس کی ہستی بڑی ننھی منی لیکن بڑی اہم ہے۔ ذرا کی ذرا اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی اہمیت بہت ہی زیادہ ہے۔ وہ سیڑھیوں پر چڑھ گئی اور اپنے کمرے

کا دروازہ کھولا۔ جارج ابھی تک بستر پر لیٹا مطالعہ کر رہا تھا۔

"بلی مل گئی؟" اس نے کتاب رکھتے ہوئے پوچھا۔

"وہ تو کہیں چلی گئی"

"کہیں نکل گئی ہو گی" اس نے اپنی آنکھوں کو آرام دیتے ہوئے کہا۔

"وہ بھی بستر پر بیٹھ گئی۔

"کتنی خواہش تھی مجھے اس بلی کی" وہ بولی "معلوم نہیں میرا دل اتنا کیوں چاہا۔ میں اس بے چاری بلی کو لانا چاہتی تھی۔ بلی کے لئے اس بارش میں پھرنا مذاق نہیں ہے"

جارج پھر مطالعہ میں مشغول ہو گیا۔

وہ اُٹھ کر سنگھار میز کے آئینے کے سامنے بیٹھ گئی اور دستی آئینے میں اپنا عکس دیکھنے لگی۔ اس نے اپنا چہرہ پہلے ایک رُخ سے دیکھا پھر دوسرے رُخ سے۔ پھر اس نے اپنے سر کی پشت اور گردن کو دیکھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے اگر میں اپنے بال اب بڑھنے دوں اور لمبے کر لوں؟" اُس نے اپنا عکس دیکھتے ہوئے کہا۔

جارج نے نظریں اُٹھا کر پشت کی طرف سے اس کی گردن کو دیکھا۔ اس کے بال لڑکوں کی طرح کٹے ہوئے تھے۔

"مجھے اسی طرح پسند ہیں جیسے اس وقت ہیں"

"میں تو اب ان سے اُکتا گئی ہوں" لڑکی نے کہا "میں لڑکوں کی سی شکل و صورت سے بڑی اُکتا گئی ہوں"

جارج نے بستر میں ذرا کروٹ لی۔ جب سے اُس نے بولنا شروع کیا اس کی نظریں لڑکی پر ہی جمی ہوئی تھیں۔

"تم اس طرح بڑی خوبصورت نظر آتی ہو۔"

اس نے آئینہ میز پر رکھ دیا اور کھڑکی کی طرف جا کر باہر دیکھنے لگی۔ اب اندھیرا پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔

"میں اپنے بالوں کو خوب کس کر اور ہموار کر کے پیچھے کی طرف بڑا سا جوڑا بنانا چاہتی ہوں جسے میں محسوس بھی کر سکوں۔ اور میں ایک بلی بھی چاہتی ہوں جسے میں گود میں لے کر بیٹھوں اور جب میں اس پر ہاتھ پھیروں تو وہ خرخر کرے۔"

"اچھا؟" جارج نے بستر پر سے پکار کر کہا۔

"اور میں میز پر اپنے چاندی کے چھری کانٹوں سے کھانا چاہتی ہوں، میز پر مومی شمعیں بھی روشن ہوں۔ اور میں چاہتی ہوں کہ بہار کا موسم ہو اور میں آئینے کے سامنے بیٹھ کر اپنے بالوں میں کنگھی کروں، اور میرے پاس ایک بلی بھی ہو اور کچھ نئے کپڑے بھی۔"

"اوہ چپ رہو۔ تم کچھ پڑھتی کیوں نہیں۔" جارج نے کہا اور پھر پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔

اس کی بیوی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ کافی اندھیرا چھا چکا تھا اور تاڑ کے درختوں پر ابھی تک بارش ہو رہی تھی۔

"بہر حال، مجھے ایک بلی تو ضرور چاہیئے۔ مجھے ایک بلی چاہیئے اور بلی بھی ابھی چاہیئے۔ اگر میں لمبے بالوں سے یا اور کسی چیز سے لطف نہیں اٹھا سکتی تو بلی تو لے سکتی ہوں۔"

جارج اب اس کی باتوں پر دھیان نہ دے رہا تھا۔ وہ اپنی کتاب پڑھ رہا تھا۔ اس کی بیوی نے اُس طرف دیکھا جہاں چوک میں بتیاں جلنے

لگی تھیں۔

کسی نے دروازے پر دستک دی۔

"چلے آؤ۔" جارج نے آواز دی اور اپنی کتاب پر سے نظریں اُٹھا کر دیکھا۔ دروازے میں خادمہ کھڑی تھی۔ اس نے کچھوے کے رنگ کی ایک بلّی کو زور سے اپنے ساتھ جمٹا رکھا تھا، اور اس کی ٹانگیں نیچے لٹک رہی تھیں۔

"معاف فرمائیے" اس نے کہا۔ "مالک نے یہ بلّی خاتون کے لئے بھیجی ہے۔"

ایک سرسری تفتیش

برفباری اتنی زیادہ ہوئی تھی کہ برف کی سطح کھڑکی سے بھی اونچی ہو چکی تھی۔ سورج کی ہلکی ہلکی روشنی کھڑکی سے داخل ہو کر اُس نقشے پر پڑ رہی تھی جو پیڑ کے تختوں کی دیوار پر بنا ہوا تھا۔ سورج کافی بلند ہو چکا تھا اس لئے روشنی برف کے اُوپر سے ہوتی ہوئی اندر داخل ہوتی تھی۔ لکڑی کے اس مکان کے سامنے کے رُخ برف کھود کر ایک خندق بنا دی گئی تھی جو روزانہ دھوپ کی گرمی سے پگھل پگھل کر کشادہ ہوتی جا رہی تھی۔ یہ مارچ کے آخری ایام تھے۔ دیوار کے ساتھ میز پر میجر بیٹھا تھا۔ اور اُس سے کچھ فاصلے پر دوسری میز پر ان کا اجیٹن۔

میجر کی آنکھوں کے گرد دو سفید حلقے نظر آ رہے تھے یعنی وہ جگہ جو اس کی عینک نے برف پر چمکنے والی دھوپ سے بچالی تھی۔ اس کا باقی چہرہ جل چکا تھا اور جل کر سانولا پڑ گیا تھا اور سنولائی ہوئی جلد پھر جل گئی تھی۔ اس کی ناک سُوجی ہوئی تھی - - - - - - - اور چھالے پھوٹ

جانے کے بعد چمڑی ادھڑی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ کاغذات دیکھتے ہوئے وہ بار بار اپنی بائیں ہاتھ کی انگلیوں کے پپوٹے میز پر رکھی ہوئی طشتری میں سے تیل سے بھگوتا اور پھر بڑی آہستگی سے اپنے منہ پر تیل چپڑتا جاتا۔ وہ اپنے پپوٹوں کو احتیاط سے طشتری کے کناروں پر پونچھ لیتا کہ صرف تیل کی ہلکی سی تہہ باقی رہ جائے۔ اپنے ماتھے اور گالوں کو چپڑ لینے کے بعد اس نے بڑی نرمی سے اپنی ناک کو انگلی اور انگوٹھے کے درمیان لیکر تیل لگایا۔ جب وہ فارغ ہوا تو تیل والی طشتری اُٹھا کر اس چھوٹے سے کمرے میں چلا گیا جہاں وہ سویا کرتا تھا۔ "میں تھوڑی دیر سونا چاہتا ہوں۔ تم یہ کام ختم کر لینا۔" اُس نے اپنے اجیٹن سے کہا۔

"بہت بہتر، میجر صاحب۔" اجیٹن نے جواب دیا۔ اس نے کرسی پر پیچھے کو جھک کر انگڑائی لی۔ اپنے کوٹ کی جیب سے ایک چھوٹی سی کتاب نکالی اور اسے میز پر رکھ کر اپنا پائپ سلگا لیا۔ پھر میز پر آگے کو جھک کر کتاب پڑھنے اور پائپ کے کش لگانے میں مصروف ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے کتاب بند کر کے جیب میں ڈال لی۔ اسے بہت سا سرکاری کام کرنا تھا اسلئے جب تک وہ ختم نہ ہو جائے پڑھنے میں لطف نہ آتا تھا۔ سورج پہاڑیوں کے پیچھے چلا گیا تھا اس لئے اب مکان کی دیوار پر روشنی بھی نہ پڑ رہی تھی ایک سپاہی نے آ کر چیڑ کی لکڑی کے چھوٹے بڑے ٹکڑے انگیٹھی میں ڈال دئے۔

"شور نہ کرو۔ پائنین، میجر صاحب سو رہے ہیں۔" اجیٹن نے سپاہی سے کہا۔

پائنین کا رنگ سانولا تھا اور وہ میجر کا اردلی تھا۔ اس نے بڑی احتیاط سے لکڑیوں کے ٹکڑے انگیٹھی میں لگا دئے اور پھر اس کا دروازہ بند کر کے مکان کے پچھلی طرف چلا گیا۔ اجیٹن اپنے کاغذات میں مصروف رہا۔

"ٹونانی!" میجر نے آواز دی
"ہاں میجر صاحب"
"پائنین کو میرے پاس بھیج دو۔"
"پائنین!" اجٹین نے آواز دی۔ پائنین کمرے میں آگیا۔ "تمہیں میجر صاحب بلاتے ہیں۔" اجٹین نے کہا۔

پائنین مکان کا بڑا کمرہ طے کر کے میجر کے کمرے کی طرف گیا۔ اس نے نیم وا دروازے پر دستک دی۔ "میجر صاحب؟"

"اندر آجاؤ" اجٹین نے میجر صاحب کو کہتے سنا۔ "اور دروازہ بند کر دو۔"

کمرے کے اندر میجر دیوار میں لگے ہوئے تختے پر لیٹا تھا۔ پائنین اس کے پاس کھڑا ہو گیا۔ میجر نے اپنا سر اس تھیلے پر رکھا ہوا تھا جس میں فالتو کپڑے بھر کر اس نے تکیہ بنا لیا تھا۔ اس کا لمبوترہ، جلا ہوا اور تیل سے چپڑا ہوا چہرہ پائنین کی طرف گھور رہا تھا۔ اس کے ہاتھ کمبلوں کے اوپر پڑے تھے۔

"تمہاری عمر انتیس سال ہے؟" میجر نے پوچھا
"ہاں میجر صاحب۔"
"تم نے کبھی محبت کی ہے؟"
"کیسی محبت، میجر صاحب؟"
"کبھی محبت کی ہے —— کسی لڑکی سے؟"
"لڑکیوں کے ساتھ کئی دفعہ موقع ملا ہے۔"
"میں نے یہ نہیں پوچھا۔ میں نے پوچھا ہے کبھی محبت کی ہے۔ کسی

کسی لڑکی سے۔"

"ہاں میجر صاحب۔"

"تم اس لڑکی سے اس وقت محبت کرتے ہو؟ تم اس کی طرف خط نہیں لکھتے۔ میں نے تمہارے سارے خط پڑھ لئے ہیں۔"

"ہیں اس سے محبت تو کرتا ہوں لیکن اس کی طرف خط نہیں لکھتا۔"

"سچ کہتے ہو؟"

"جی، سچ کہتا ہوں۔"

"ٹونانی۔" میجر نے اُسی آواز سے کہا۔" کیا تم میری آواز سُن رہے ہو؟"
دوسرے کمرے سے کوئی جواب نہ ملا۔

"وہ ہماری باتیں نہیں سن سکتا۔" میجر نے کہا۔" اور تم سچ کہتے ہو کہ تمہیں ایک لڑکی سے محبت ہے؟"

"جی ہاں، سچ۔"

"اور" میجر نے تیز نظروں سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "یہ کہ تم بدچلن بھی نہیں ہو؟"

"معلوم نہیں صاحب آپ کا بدچلن سے کیا مطلب ہے"

"دیکھو" میجر نے کہا "تم میرے سامنے پاک صاف بننے کی کوشش نہ کرو۔"

پائنین کی نظریں جھک گئیں۔ میجر نے اس کے سانولے چہرے کی طرف دیکھا، پھر نیچے سے اُوپر تک اور پھر اس کے ہاتھوں کی طرف۔ اور پھر مسکراتے ہوئے بولا" اور تم یہ بھی نہیں چاہتے۔" میجر کچھ کہتے کہتے رُک گیا۔ پائنین کی نظریں اب بھی جھکی ہوتی تھیں۔" کہ حقیقت میں تمہاری سب سے

بڑی خواہش یہ نہیں ہے کہ ۔" پائنین اب بھی زمین کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میجر نے اپنا سر تکیئے پر رکھ دیا اور مسکرا دیا۔ اسے پوری تسکین ہو گئی! تو جی زندگی بھی کتنی پیچیدہ قسم کی ہوتی ہے" "تم بڑے اچھے لڑکے ہو" اس نے کہا "پائنین تم بڑے اچھے لڑکے ہو" . . . .

. . . . . لیکن اپنے آپ کو پاک صاف ظاہر کرنے کی کوشش نہ کیا کرو۔ اور ہاں اس بات کا خیال رکھو کہ کوئی اور تمہیں آکر یہاں سے نہ لے جائے۔"

پائنین میجر کے بستر کے ساتھ لگا ہوا خاموش کھڑا تھا۔

ڈرو نہیں" میجر نے کہا۔ اس نے دونوں ہاتھ کمبل پر سکیڑ رکھے تھے۔ "میں تمہیں کوئی تکلیف نہ دوں گا۔ اگر تم چاہتے ہو تو اپنی پلٹن میں واپس چلے جاؤ۔ لیکن میری ملازمت میں یہیں پڑے رہو۔ تو اس میں تمہاری ہی بہتری ہے۔ یہاں مارے جانے کا بہت کم امکان ہے۔"

"میرے متعلق کوئی کام ہے میجر صاحب؟"

"نہیں" میجر نے کہا "جاؤ جو کام تم کر رہے تھے کر لو۔ اور باہر جاتے ہوئے دروازہ کھلا چھوڑ دو۔"

پائنین دروازہ کھلا چھوڑ کر باہر نکل گیا۔ اجٹین نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو وہ عجیب بے ڈھنگے پن سے کمرہ طے کرتا ہوا باہر جا رہا تھا۔ پائنین کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اور اس کی پہلی چال جب وہ لکڑیاں لے کر آیا تھا، اور موجودہ چال میں بڑا فرق تھا۔ اجٹین اسے جاتے ہوئے دیکھ کر مسکرا دیا۔ پائنین انگیٹھی کے لئے اور لکڑیاں لے آیا۔ میجر اپنے بستر میں لیٹا کپڑے سے ڈھنپے ہوئے خود اور برف میں پہنے

والی عینک کی طرف دیکھ رہا تھا جو دیوار کے ساتھ ٹنگی ہوئی تھی اور اس کے چلنے کی آواز سُن رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ کہیں یہ ننھا شیطان میرے سامنے جھوٹ تو نہیں بول گیا۔

دن بھر کا انتظار

ہم ابھی بستر ہی میں کروٹیں بدل رہے تھے کہ وہ کھڑکیاں بند کرنے کے لئے آ گیا۔ اس کی طبیعت ناساز معلوم ہوتی تھی۔ اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا، چہرہ زرد تھا اور کمرے میں ایسے چل رہا تھا جیسے حرکت کرنے سے اس کے اعضا دُکھ رہے ہیں۔

"کیا بات ہے شاٹز؟"

"سر میں درد ہو رہا ہے۔"

"تم جا کر اپنے بستر میں لیٹ جاؤ۔"

"نہیں، کوئی ایسی تکلیف بھی نہیں۔"

"نہیں تم لیٹ ہی جاؤ۔ میں کپڑے پہن کر ابھی آتا ہوں اور تمہیں دیکھتا ہوں۔"

لیکن جب میں نیچے آیا تو وہ اُسی طرح کپڑے پہنے ہوئے آگ کے پاس بیٹھا تھا اور بڑا بیمار اور دُکھی نظر آ رہا تھا۔ ابھی اس کی عمر نو سال

ہی تھی۔ جب میں نے اس کے ماتھے پر ہاتھ لگایا تو وہ بخار سے تپ رہا تھا۔

"تم اوپر جاکر بستر میں لیٹ جاؤ" میں نے کہا "تم بیمار ہو۔"

"میں بالکل ٹھیک ہوں،" اس نے پھر کہا۔

ڈاکٹر نے آکر اسے تھرمامیٹر لگایا۔

"کتنا بخار ہے؟" میں نے پوچھا

"ایک سو دو۔"

ڈاکٹر نیچے تین قسم کی گولیاں چھوڑ گیا جن کے رنگ مختلف تھے اور ان کے متعلق ہدایات بھی دے گیا۔ ایک بخار کم کرنے کے لئے، دوسری مسہل تھی اور تیسری، تیزابیت دور کرنے کے لئے۔ اس نے بتایا تھا کہ انفلوئنزا کے جراثیم تیزابی حالت میں ہی نشوونما پاتے ہیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ بیماری کے متعلق سب کچھ جانتا ہے اور کہہ گیا تھا کہ اگر ایک سو چار درجے سے آگے نہ بڑھا تو فکر کی کوئی بات نہیں۔ وبائی انفلوئنزا کا یہ ہلکا سا حملہ تھا اور اگر نمونیہ سے احتیاط رکھی گئی تو خطرے کی کوئی بات نہیں۔

کمرے میں واپس جاکر میں نے لڑکے کا بخار درج کیا اور مختلف قسم کی ادویات دینے کے اوقات درج کر لئے۔

"میں تمہیں کچھ پڑھ کر سناؤں؟"

"سنایئے، اگر آپ کو تکلیف نہ ہو،" لڑکے نے جواب دیا۔ اس کا چہرہ سفید ہو رہا تھا اور آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے تھے۔ وہ چپ چاپ بستر میں لیٹا ہوا تھا اور اپنے ماحول سے بالکل بے پروا معلوم ہوتا تھا۔

میں نے ہاورڈ پائیل کی کتاب "بحری ڈاکو" بلند آواز میں پڑھنی شروع کی۔ لیکن میں نے دیکھا کہ وہ اس پر کوئی توجہ نہیں دے رہا۔

"اب طبیعت کیسی ہے، شاٹز؟" میں نے پوچھا

"ابھی تک تو ویسی ہی ہے۔"

"میں نے کتاب اپنے طور پر پڑھنی شروع کر دی اور دوسری دوا کے وقت کا انتظار کرنے لگا۔ اسے اب تک سو جانا چاہیئے تھا لیکن جب میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ پائنتی کی طرف بڑے عجیب و غریب طریقے سے گھور رہا تھا۔

"تم سونے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟ دوا کے وقت پر میں تمہیں جگا لوں گا۔"

"میرا خیال ہے میں جاگتا ہی رہوں"

تھوڑی دیر بعد وہ پھر بولا "اپا آپ کا میرے پاس بیٹھے رہنا ضروری تو نہیں ہے۔ اگر آپ کو تکلیف ہوتی ہو تو آپ بے شک چلے جائیں"

"نہیں مجھے تکلیف تو کوئی نہیں۔"

"میرا مطلب ہے کہ اگر آپ کو تکلیف ہو تو آپ بے شک نہ بیٹھیں؟"

میں نے سمجھا شاید بخار کی شدت کی وجہ سے اس کا دماغ بہک گیا ہے، اس لئے اسے گیارہ بجے کی دوا دے کر میں باہر چلا آیا۔

وہ دن روشن تو تھا لیکن بڑا ہی سرد۔ زمین برف کی ہلکی سی تہہ سے ڈھپی ہوئی تھی۔ تمام بے برگ و بار درخت، جھاڑیاں، گھاس اور ننگی زمین پر برف کی باریک تہہ روغن کی طرح چڑھی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ میں اپنے آئرستانی کتے کو لے کر تھوڑی دور سیر کے لئے گیا لیکن اس شیشے کی سی ہموار سطح پر چلنا بڑا ہی مشکل تھا۔ میرا کتا بھی پھسلا اور میں خود بھی دو دفعہ گرا ایک

دفعہ تو میری بندوق لڑھکتی ہوئی دُور تک جا پہنچی۔

ایک جگہ مٹی کے ایک تودے پر جھاڑیوں کے نیچے سے بہت سے بٹیر ڈر کر اُڑے۔ میں نے دو مار گرائے، باقی اڑ کر نظروں سے غائب ہو گئے لیکن جھرمٹ درختوں پر بیٹھ گئے لیکن ان میں سے زیادہ تر جھاڑیوں میں گھس گئے۔ انہیں اُڑانے کے لئے ضروری تھا کہ برف سے لپے ہوئے مٹی کے تودوں پر کود کود کر انہیں ڈرایا جائے۔ لچک دار جھاڑیوں پر کھڑے ہو کر انہیں اُڑانا اور پھر مارنا کافی مشکل کام تھا۔ میں نے دو اور مارے اور پانچ بچ کر نکل گئے۔ میں گھر کی طرف لوٹا تو اس بات پر خوش تھا کہ گھر کے قریب ہی اتنا بڑا جھرمٹ موجود ہے اور کل انہیں پھر شکار کروں گا۔

گھر آکر مجھے معلوم ہوا کہ لڑکے نے کسی کو کمرے میں بھی داخل نہیں ہونے دیا۔

"کوئی آدمی اندر نہ آئے" وہ کہتا تھا "جو بھی اندر آئے گا اُسے میری بیماری چمٹ جائے گی۔"

جب میں اس کے پاس گیا تو وہ بالکل اسی طرح لیٹا پڑا تھا جس طرح میں اسے چھوڑ کر گیا تھا۔ اس کا چہرہ اب بھی سفید تھا لیکن بخار کی وجہ سے اس کے گالوں کا اُوپر کا حصہ سرخ ہو رہا تھا۔ اب بھی چارپائی کی پائنتی کی طرف اس کی نظریں گڑی ہوئی تھیں۔

میں نے تھرما میٹر لگایا

"کتنا بخار ہے؟"

"سو کے قریب ہے" میں نے بتایا "حقیقت میں ایک سو دو سے چار پوائنٹ زیادہ تھا۔

"پہلے تو ایک سو دو تھا" اس نے کہا
"کس نے کہا تھا؟"
"ڈاکٹر نے۔"
"بخار بالکل معمولی ہے" میں نے کہا "فکر کی کوئی بات نہیں۔"
"مجھے فکر تو کوئی نہیں، لیکن میں اس کے متعلق سوچنے سے رہ بھی نہیں سکتا۔"
"سوچنے کی کونسی بات ہے" میں نے کہا "اسے صبر سے برداشت کرو۔"
"میں برداشت تو کر رہا ہوں۔" اس نے سامنے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی بات کے لئے اپنے آپ پر بڑا ضبط کئے ہوئے ہے۔
"یہ گولی پانی کے ساتھ نگل لو۔"
"اس سے کچھ فائدہ ہوگا؟"
"ہاں کیوں نہیں۔"
میں بیٹھ گیا اور "بحری ڈاکو" کی کتاب پھر پڑھنا شروع کر دی۔ لیکن میں نے دیکھا کہ وہ اسے سن نہ رہا تھا اس لئے میں نے پڑھنا بند کر دیا۔
"آپ کا کیا اندازہ ہے، میری جان کس وقت نکلے گی؟" اس نے پوچھا
"کیا؟" میں نے حیرانی سے پوچھا
"میرے مرنے میں اب کتنا وقت باقی ہے؟"
"تم مر نہیں رہے، تمہیں ہو کیا گیا ہے؟"
"مر تو رہا ہوں۔ میں نے خود سنا تھا کہ مجھے ایک سو دو درجے کا بخار ہے،"

"بے وقوف نہ بنو۔ ایک سو دو درجے کے بخار سے کوئی نہیں مرتا۔
"مجھے سب معلوم ہے۔ فرانس میں مجھے سکول کے لڑکوں نے بتایا تھا
کہ چوالیس درجے کی حرارت میں انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ اور مجھے تو
ایک سو دو درجے کا بخار ہے۔
یہ لڑکا صبح نو بجے سے اس وقت تک موت کے انتظار میں تھا۔
"ارے بھولے بھالے شائز" میں نے کہا "ان درجوں میں تو میلوں
اور کلو میٹروں کی طرح فرق ہے۔ تم مر نہیں رہے۔ وہ تھرمامیٹر الگ قسم
کا ہوتا ہے۔ اُس تھرمامیٹر پر سینتیس درجے طبعی حرارت ہوتی ہے۔ اور
اس تھرمامیٹر پر اٹھانوے۔"
"کیا آپ کو اچھی طرح علم ہے؟"
"بالکل" میں نے کہا "ان میں میلوں اور کلو میٹروں کی طرح فرق ہے۔
تمہیں معلوم ہے جب ہم ستر میل کار پر چلیں تو اس کے کتنے کلو میٹر بنتے
ہیں؟"
"اوہو، میں اب سمجھا۔"
میں نے دیکھا کہ یکایک، اُس کی نظر جو پائنتی کی طرف جمی ہوئی تھی یکایک
ڈھیلی پڑ گئی۔ اپنے اعضاء پر اس کا اکڑاؤ بھی نرم پڑ گیا اور اگلے روز وہ
غیر اہم باتوں کے متعلق بڑی بے پروائی برتتا رہا۔

پُل پہ بیٹھا ہُوا بوڑھا

ایک بوڑھا جس نے لوہے کی کمانیوں والی عینک اور دُھول سے اَٹے ہوئے کپڑے پہن رکھے تھے سڑک کے کنارے بیٹھا تھا۔ دریا پر کشتیوں کا ایک پل بنا ہوا تھا جسے گاڑیاں، ٹرک، مرد، عورتیں اور بچے عبور کر رہے تھے۔ گھوڑا گاڑیاں پُل پر سے ڈگمگاتی ہوئی دریا کے ڈھلوان کنارے پر چڑھتیں اور سپاہی پہیوں پر زور لگا کر ان کی امداد کرتے۔ ٹرک چیختے ہوئے چڑھائی چڑھ کر اس بھیڑ میں سے نکل جاتے اور کسان ٹخنوں تک گہری دُھول میں پیدل چلے جاتے۔ لیکن بوڑھا وہاں بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ وہ اتنا تھک گیا تھا کہ اب اس سے آگے نہ چلا جاتا تھا۔

مجھے پُل عبور کر کے مورچے کا معائنہ کرنا تھا اور یہ دیکھنا تھا کہ دشمن کی فوج کہاں تک بڑھ چکی ہے۔ چنانچہ میں یہ کام کر کے پُل پر سے واپس آ گیا۔ اب گاڑیاں بہت کم رہ گئی تھیں اور چند پیدل چلنے والے، لیکن بوڑھا ابھی تک وہیں بیٹھا تھا۔

"تم کہاں سے آ رہے ہو؟" میں نے اس سے پوچھا
"سان کارلوس سے" اُس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ یہ اُس کا وطن تھا، اسی لئے اس کا نام لیتے ہوئے اُسے خوشی محسوس ہوئی اور مسکرا دیا۔
"میں جانوروں کی رکھوالی کرتا تھا۔" اُس نے بتایا
"اچھا؟" میں اس کی بات اچھی طرح نہ سمجھ سکا۔
"ہاں۔ اور میں وہاں ٹھہرا رہا اور اپنے جانوروں کی دیکھ بھال کرتا رہا۔ سان کارلوس کا قصبہ سارا خالی ہو گیا تھا لیکن میں اکیلا وہاں ٹھہرا رہا۔"

وہ نہ گڈریا معلوم ہوتا تھا اور نہ چرواہا۔ میں نے اس کے سیاہ گرد آلود لباس اس کے گرد آلود چہرے اور لوہے کی کمانیوں والی عینک کو نظر بھر کر دیکھا اور کہا "تم نے کون سے جانور پال رکھے تھے۔"
"مختلف قسم کے جانور" اُس نے جواب دیا اور پھر بڑے افسوس سے سر ہلا کر بولا "مجھے وہ سب وہیں چھوڑنے پڑے۔"
میرا دھیان پل کی طرف تھا۔ ایبرو ڈیلٹا کی اُس سرزمین کی طرف جو افریقہ سے اتنی ملتی جلتی تھی، اور اس بات کا منتظر تھا کہ غنیم کب نظر آتا ہے میں اُن آوازوں کے انتظار میں تھا جو اُس پُراسرار واقع کا پیش خیمہ ہوتے ہیں جسے فوجوں کا آپس میں بھڑ جانا کہا جاتا ہے۔ لیکن بوڑھا آدمی اب بھی وہیں بیٹھا تھا۔

"وہ کون سے جانور تھے، بڑے میاں؟" میں نے پوچھا
"سب ملا کر تین تھے۔" اُس نے بتایا "دو بکریاں اور ایک بلی۔ لیکن

ان کے علاوہ چار جوڑے کبوتروں کے بھی تھے۔"

"اور تمہیں یہ سب چھوڑنے پڑے؟" میں نے پوچھا

"ہاں، توپ خانے کی وجہ سے۔ کپتان نے توپ خانے کی وجہ سے مجھے نکال دیا۔"

"تمہارا کنبہ تو نہیں ہے یا یا؟" میں نے پل کے دوسرے سرے پر آخری چند گاڑیوں کو گھاٹی پر سے اُترتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

"نہیں، صرف یہ جانور تھے جو میں نے پال رکھے تھے۔ بلی کا تو مجھے اتنا فکر نہیں ہے بلی تو اپنا انتظام آپ کر لیتی ہے، لیکن دوسروں کا کیا بنے گا!

"تمہارے سیاسی خیالات کیا ہیں؟"

"میں تو سیاست نہیں جانتا۔" اس نے جواب دیا "میری عمر چھہتر سال ہے۔ میں بارہ کوس چل کر آیا ہوں اور میرا خیال ہے کہ اب میں ایک قدم بھی آگے نہیں جا سکتا۔"

"یہ ٹھہرنے کے لئے موزوں جگہ نہیں ہے۔" میں نے بتایا۔ "اگر تم جا سکو تو اس سڑک سے آگے جہاں ٹارٹوزا کو راستہ پھوٹتا ہے ٹرک چل رہے ہیں۔"

"میں تھوڑی دیر اور دم لے لوں۔" اس نے کہا "اور پھر چلا جاؤں گا۔ ٹرک کس طرف جاتے ہیں؟"

"بارسیلونا کی طرف۔" میں نے اسے بتایا۔

"اس طرف تو میرا کوئی شناسا نہیں ہے۔ لیکن آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔"

اس نے تھکی ہوئی اور خالی سی نظروں سے میری طرف دیکھا اور پھر

اس طرح جیسے وہ کسی نہ کسی کو اپنے تفکرات کا ساجھی بنانا چاہتا ہو بولا
"بلی کے متعلق تو مجھے کوئی فکر نہیں۔ لیکن باقیوں کا کیا بنے گا۔ دوسروں کے
متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ اُن کا بھی کچھ نہ کچھ انتظام ہو جائے گا۔"

"کیا تمہارا یہی خیال ہے؟"

"ہاں، کیوں نہیں۔" میں نے دریا کے دوسرے کنارے کی طرف دیکھتے
ہوئے کہا۔ جہاں اب کوئی گاڑی دکھائی نہ دیتی تھی۔

"لیکن وہ توپ خانے کی موجودگی میں کیا کر سکیں گے۔ مجھے بھی تو
انہوں نے توپ خانے کی وجہ سے نکال دیا ہے؟"

"تم نے کبوتروں کو کھول تو دیا تھا ناں؟"

"ہاں۔"

"تو پھر وہ اُڑ جائیں گے۔

"ہاں وہ تو اُڑ جائیں گے لیکن باقی۔ باقیوں کے متعلق تو میں سوچ
بھی نہیں سکتا۔" اس نے بڑے اضطراب سے کہا۔

"اگر تم نے دم لے لیا ہے تو اب چلے جاؤ۔" میں نے تقاضہ کیا "ذرا
اُٹھو اور ہمت کرو۔"

"شکریہ۔" کہتے ہوئے وہ اُٹھ کر کھڑا تو ہو گیا۔ لیکن دائیں بائیں
جھومنے لگا اور پھر اسی دھول میں بیٹھ گیا۔

"میں جانوروں کو پال رہا تھا۔" اس دفعہ اس کا رُوئے سخن میری
طرف نہ تھا۔ "میں تو صرف جانوروں کو پال رہا تھا۔"

میں اس کے لئے کچھ بھی نہ کر سکتا تھا۔ وہ ایسٹر کی اتوار تھی اور

فاشسٹ ایبرو کی طرف بڑھے آرہے تھے۔ اُس روز فضا ابر آلود تھی اور اور بادل جھکے کھڑے تھے اسی لیے ان کے ہوائی جہازوں نے حملہ نہ کیا تھا۔ یہ بوڑھے کے لئے خوش قسمتی کی بات تھی، ہاں اس کے علاوہ ایک اور بات بھی کہ بلیاں کسی نہ کسی طرح اپنا انتظام آپ کرلیتی ہیں اور بس۔